مئی ۱۹۶۶ء

جلد ۶۵ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۵	مئی ۱۹۶۶ء	عدد ۳

چندہ سالانہ	دفتر ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یوں تو پاکستان کے قیام کے کچھ مدت بعد ہی اخلاقی انحطاط کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن پچھلے چند سال سے اس کی رفتار میں بڑا تشویشناک اضافہ ہو رہا ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھیے آپ کو ایک صفحے پر ہی اخلاقی بے راہ روی کے بیسیوں بڑے سنگین اور شرمناک واقعات ملیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ کسی ایسے ماحول میں نہیں رہ رہے جس میں اخلاق، شرافت، شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی جیسی اخلاقی اقدار کوئی فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہیں بلکہ آپ اپنے آپ کو ایک ایسی فضا میں سانس لیتے ہوئے پائیں گے جس میں نفس کی تربیت کا نہ صرف کوئی انتظام نہیں بلکہ اس کے خلاف ایک نہایت کھلا رجحان موجود ہے۔

پھر اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ قومی زندگی میں جن حضرات پر اخلاقِ عامہ کو سنوارنے اور اخلاقی اقدار کی حفاظت و پاسبانی کرنے اور قوم کی ذہنی اور جذباتی تربیت کر کے اُسے سیرت و کردار کے مضبوط سانچوں میں ڈھالنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ نہ صرف اپنے فرائض سے غافل نظر آتے ہیں بلکہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے اس بدنصیب قوم کے بچے کھچے اسلامی اخلاق کو ختم کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اور وہ اس کی اجتماعی زندگی کو مغرب کی معاشرتی زندگی کا نمونہ بنانے کا عزم کر چکے ہیں۔

کسی معاشرے کے اخلاقی رجحانات کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لیے عام طور پر چار چیزیں دیکھی جاتی ہیں:

- عورت کا سوسائٹی میں مقام و مرتبہ اور اُس کا دائرۂ کار۔
- نوخیز نسلوں کی اخلاقی تربیت کا نہج
- فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دینے والے اسباب و محرکات کی روک تھام کے لیے معقول اور مناسب انتظام۔
- ایک ایسا مضبوط نظامِ احتساب جو ان سب اداروں کا پُوری احساسِ ذمہ داری کے ساتھ محاسبہ کرے۔

جو شخص اسلامی تعلیمات سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام عورت کو "شمعِ انجمن" بنانے کے بجائے چراغ خانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے انسان کی اخلاقی تربیت پر بڑا زور دیا ہے اور اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھر کا ماحول جو بچے کی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم فطری مکتب ہے وہ اسلام کی اخلاقی شعاعوں سے پُوری طرح روشن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گھر کی چار دیواری کو اخلاق و روحانیت کے نور سے منوّر کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر عورت پر ڈالی ہے اور اس اہم فرض کی ادائیگی کا اُسے ہی ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے مسلمان خواتین کو یہ حکم صادر فرمایا ہے:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ

اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور جاہلیّتِ قدیم کے مطابق اپنے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو۔ نماز کی پابندی کرو، اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور اللہ اور اُس کے رسول کے احکام بجالاؤ۔ اللہ

لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۔

(الاحزاب - ۳۳-۳۴)

تو بس یہی چاہتا ہے کہ اُسے نبی کے گھر والو تم کو آلودگی سے دُور رکھے اور تمہیں پوری طرح پاکیزہ رکھے۔ اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور اس کی حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں انہیں یاد کرتی رہو۔ بیشک اللہ بڑا باریک بین اور پُورا خبردار ہے۔

ان آیات سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس بات کی بھی ہدایت کی ہے کہ تم غیر محرم مردوں کے ساتھ بات کرتے ہوتے اپنی گفتگو میں لوچ اور نزاکت نہ پیدا کرو کیونکہ اس میں اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ ایک آدمی جس کی نیت میں فتور اور جس کے مزاج میں فساد ہے وہ آپ کے نرم لب ولہجہ اور اس کی رعنائی اور دلفریبی سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں کوئی غلط خیال نہ بٹھالے اس حکم کی جو اہمیت اُس وقت کی سوسائٹی میں تھی، وہی اہمیت عام مسلمان عورتوں کے لیے آج کی غیر صالح فاسقانہ وفاجرانہ فضا میں بھی ہے۔ فقہاء نے اس حکم پر قیاس کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عورتیں تو ایک طرف رہیں خود مردوں کو بھی ایسی باتیں کرنے سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے جن سے سفلی جذبات برانگیختہ ہونے کا احتمال ہو۔ ابن جصاص نے احکام القرآن میں انہی آیات سے استدلال کرتے ہوتے یہ کہا ہے کہ عورت کے لیے اتنی بلند آواز میں گفتگو کرنا ناجائز ہے جسے غیر محرم سُن سکیں۔

اختلاط مرد وزن کے رجحان کی پُوری طرح ممانعت کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے وہ حکم صادر فرمایا ہے جس کی طرف محولہ بالا آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تم گھروں کے اندر سکون اور قرار کے ساتھ رہو اور اپنی زیب وزینت لوگوں کو نہ دکھاتی پھرو۔ لفظ قَرْنَ کو بعض مفسّرین نے وقار سے مشتق قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن جصّاص احکام القرآن میں اس آیت کی تصریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں: ای کن اهل وقار وهدوءٍ وسکینة یعنی تم گھروں میں طمانیتِ قلب

کے ساتھ پُروقار طریق سے رہو۔

قرآن مجید نے نہ صرف عورتوں کو اس شریفانہ اور معقول طرزِ عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے بلکہ ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ کا حکم صادر فرما کر اُس فاسقانہ طرزِ عمل کو اختیار کرنے کی بڑی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے جس کے تحت صنفِ نازک میں اپنے حُسن اور اپنی آرائش و زیبائش سے مردوں کی نظروں کو مفتوح کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ بن سنور کر گھروں کی محفوظ چار دیواری سے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

قرآن مجید نے اگرچہ الجاہلیۃ الاُولیٰ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اُس مشرکانہ تہذیب و تمدن کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اسلام سے قبل دنیا، خصوصاً عرب دنیا میں یونانی و رومی تمدن کے اثر سے رائج تھی لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ تبرج الجاہلیۃ کوئی ایسی رسم نہیں جو اب بالکل مٹ چکی ہے بلکہ یہ ایک ایسی بُرائی ہے جو ماضی میں بھی موجود تھی اور اب بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ درحقیقت مادہ پرستانہ طرزِ فکر کا عملی اظہار ہے۔

جب سے دنیا قائم ہوئی ہے اسی وقت سے دو مختلف اور متضاد طرزِ فکر آپس میں ایک دوسرے سے متصادم چلے آرہے ہیں۔ ایک طرزِ فکر یہ ہے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی سب کچھ ہے اس لیے انسان کو اپنی حسی لذّات کی تسکین کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور اس راہ میں کسی قسم کی کوئی پابندی برداشت نہ کرنا چاہیے۔ اس طرزِ فکر نے یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں شدید بگاڑ پیدا کیا ہے لیکن اس نے سب سے زیادہ نقصان عورت کو پہنچایا ہے۔ اس کی بنیاد پر جو اجتماعی زندگی تشکیل کی گئی ہے اس میں عورت مرد کے سفلی جذبات کی تسکین کا محض ایک ذریعہ ہے اور وہ اس معاملے میں جتنی ہنرمندی، چابکدستی بلکہ فنکارانہ مہارت دکھائے گی اسی نسبت سے کامیاب ہوگی۔

اس کے برعکس دوسرا طرزِ فکر جس کے مطابق انسان کو صرف حسّی لذّات کی تسکین کے لیے

نہیں بلکہ بعض اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے، عورت کو مرد کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بناتا بلکہ اُسے وہ مقدس مرتبہ اور مقام دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے اُس کے اس منصب اور اُس کی ذمہ داریوں کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

المرأة راعیة علی بیت زوجہا وھی مسئولة (بخاری)

عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمران ہے اور وہ اپنی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔

گھر کی چار دیواری ہی انسانی معاشرے کی وہ بنیادی اکائی ہے جس کے اثرات کسی سوسائٹی بلکہ پوری انسانیت پر مترتب ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان آنکھ کھولتا ہے اور یہی وہ ماحول ہے جس کے اچھے یا برے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر اُس کے ذہن کی صاف لوح پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر گھریلو ماحول شرافت اور اخلاقِ صالح سے معمور ہوگا تو اس کے صحت مند اثرات بچے کے ذہن پر لازماً پڑیں گے بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ بچپن کے غیر محسوس تاثرات انسان کے قلب و دماغ پر تاحینِ حیات قائم رہتے ہیں۔ مگر گھریلو ماحول کی پاکیزگی اور صحت کا زیادہ تر دار و مدار عورت یا زیادہ صحیح الفاظ میں ماں پر ہوتا ہے اسی بنا پر عورت کو حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے شوہر کے گھر کی حکمران کہا ہے۔

عورت اسلامی نقطۂ نظر سے محض مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ ایسی بلند ہستی ہے جو اسلامی معاشرے کی بنیادوں کی حفاظت اور پاسبانی کرتی ہے۔ وہ معاشرہ کی ذمہ دار رکن ہے، اُس کے ذمّے چند بنیادی فرائض ہیں۔ وہ اسلامی اخلاق کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ فعّال کارکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان اہم ذمہ داریوں کی بجا آوری عورت اُسی صورت میں کر سکتی ہے جب وہ دلجمعی کے ساتھ گھر میں بیٹھ کر اولاد کی تربیت پر پوری توجہ صرف کرے۔ اس بنا پر اسلام نے اسے گھر سے باہر کی ذمّہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حافظ ابوبکر بزار حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مسلمان خواتین نے بارگاہِ

نبوت میں عرض کی کہ حضور ساری فضیلت تو مرد لوٹ لے گئے، وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل جائے۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: من قعدت منکن فی بیتھا فانھا تدرك عمل المجاھدین۔ جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔

عورتوں کے لیے گھر میں بیٹھنے کی تاکید معاذاللہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اسلام عورتوں کو قیدی کی حیثیت سے گھروں میں مقیّد رکھنا چاہتا ہے بلکہ اُس نے اُسے یہ حیثیت تقسیم کار کے طور پر دی ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ شدید ناانصافی ہے کہ عورتیں گھر کی ذمّہ داریوں سے بھی عہدہ برا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے مردوں کے دوش بدوش، دفتروں، کارخانوں، ہوٹلوں اور صنعت و تجارت کے دوسرے اداروں میں کام بھی کریں۔ اسلام نے عورت کو گھر کے سکون اور آرام اور گھر کی فضا کو اخلاق و شرافت کا نمونہ بنانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اُس نے عورت اور اُس کے بچّوں کی کفالت کی ذمّہ داری مرد پر عائد کی ہے۔ فطرت نے جس طرح مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں فرق رکھا ہے، اسی طرح ان کے فرائض اور ذمّہ داریوں کو بھی الگ الگ رکھا ہے۔

روم و یونان اور دَورِ جدید کی مادی تہذیب نے عورت کے ساتھ یہ سخت شرمناک کھیل کھیلا ہے کہ اُسے آزادی کے نام پر ایک ایسی غلامی پر رضامند کیا ہے جس میں اس کی حیثیت مردوں کے ہاتھ میں رنگین اور جاذبِ نظر کھلونوں کی سی بن کر رہ گئی ہے۔ چند برس پیشتر یورپ کے ماہرینِ نفسیات کے لیے یہ سوال بڑی الجھن کا باعث بنا کہ مشرقی عورتوں میں ہسٹیریا کا مرض اس لیے عام ہے کہ انہیں اپنے صنفی جذبات کی تسکین کے لیے آزادی نہیں ملتی مگر مغرب میں جہاں عورتوں کو اس معاملے میں بڑی آزادی حاصل ہے وہاں وہ اس

نفسیاتی مرض میں مشرقی عورتوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تعداد میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اس سوال پر بڑا غور و خوض کیا گیا اور مختلف اہلِ فکر نے اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان حضرات کے غور و فکر کے جو نتائج مختلف کتب اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں انہیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی عورت آج شدید ذہنی تکلیف اور روحانی کرب میں مبتلا ہے اُس کے اندر اپنے حُسن اور زیب و زینت کا حد سے بڑھا ہوا جذبہ نمائش اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی حرص موجود ہے اور اس نے اُس کے دماغی توازن کو بالکل بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ مغربی اُدبا اور ماہرینِ عمرانیات و نفسیات کی زبانوں سے یہ فقرہ عام سنائی دیتا ہے۔

WOME GOING TOTHE BALLS FALL HYSTERIC

رقص گاہوں کی طرف جاتے ہوئے عورتوں میں جنون کی حد تک جذبہ مسابقت پایا جاتا ہے۔

رقص گاہوں اور تھیٹروں میں بازاروں اور منڈیوں میں سکولوں اور کالجوں میں، دفتروں، بنکوں اور دوسرے کاروباری اداروں میں عورت کے دماغ میں ہمیشہ ایک ہی سودا سمایا رہتا ہے کہ کسی طرح مقابلہ حسن میں وہ دوسری عورتوں کو نیچا دکھا سکے اور زیادہ سے زیادہ مردوں کی توجہ کا مرکز بننے میں کامیاب ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ ہر لمحہ نئے نئے فیشن ایجاد کرتی ہے، نت نئی ادائیں سیکھتی ہے اور مردوں کے بہلانے کے لیے نئے نئے سامان تیار کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی ہمارا معاشرہ اخلاقی انحطاط کی اُس حد کو نہیں پہنچا جس پر کہ یورپ پہنچ چکا ہے اور ابھی ہمارے سنبھلنے کے امکانات موجود ہیں لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ یورپ میں یہ سب کچھ یکایک ظہور میں نہیں آیا بلکہ صنعتی انقلاب کے

پیکر میں یونان اور روم کی بدروح نے حلول کر کے آہستہ آہستہ مغربی سوسائٹی کو اخلاقی اعتبار سے برباد کیا ہے۔

بدقسمتی سے اس صنعتی انقلاب کا آغاز ہمارے ہاں مغرب کے صنعتی انقلاب ہی کے خطوط پر ہو چکا ہے اور یونان اور روم کی بدروح بھی اس انقلاب کے ساتھ ہی آگئی ہے اور اس نے ہماری سوسائٹی کو بڑی تیزی سے متاثر کرنا شروع کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی وہی اخلاقی فتنے بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں جنہوں نے مغربی اخلاق کا ایک ڈیڑھ صدی کے اندر اندر دیوالہ نکال کے رکھ دیا۔

ہمارے معاشرے کے اندر اخلاقی بے راہ روی کی وبا کس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ سال صرف لاہور کے تین ہسپتالوں میں ۱۲۳ ناجائز بچے پیدا ہوتے بلکہ کوہستان (۸ مئی ۱۹۶۵ء) کی خبر کے مطابق ان ناجائز بچوں کو جنم دینے والیاں اعلیٰ اور متوسط گھرانوں کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں جو ان بدنصیبوں کو جنم دینے کے بعد دوسرے یا تیسرے روز ہسپتال چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

اسی ضمن میں سالِ رواں کے جو اعداد و شمار سامنے آتے ہیں اُن کے مطابق صرف لاہور میں ہر ہفتے تیس سے لے کر چالیس تک ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں یا تو چوری چھپے ویران مقامات پر چھوڑ دیا جاتا ہے یا جن ہسپتالوں میں ان کی ولادت ہوتی ہے انہی کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کونسل برائے بہبودیٔ اطفال نے ۱۹۶۰ء میں ان بچوں کی طرف توجہ دینی شروع کی تھی۔ کونسل کی کوششوں سے اب تک ایک سو دس ناجائز بچوں کو بے اولاد جوڑوں کے حوالے کیا جا چکا ہے (کوہستان، ۲۸ فروری ۶۶ء)

ان ناجائز بچوں کی پیدائش کا مسئلہ اتنی پیچیدہ صورت اختیار کر رہا ہے کہ انجمن بہبودِ اطفال کی صدر بیگم وقار النساء نون نے انجمن کی مغربی پاکستان کی شاخ کو یہ ہدایت کی ہے کہ

وہ ان ستم زدوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک دارالامان قائم کرے (مشرق ۱۴ اپریل ۶۶ء)

اس اخلاقی انحطاط کا جائزہ لیتے ہوتے یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ تعداد صرف اُن بچوں کی ہے جو نوٹس میں آگئے ہیں اور یہ صرف لاہور شہر کا حال ہے۔ تہذیب و تمدن کے دوسرے مراکز یعنی حیدرآباد، کراچی، چاٹگام، ڈھاکہ، پشاور، راولپنڈی، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لائل پور اور ملتان میں یہ وبا کس طرح پھیل رہی ہے اس کو بڑی آسانی سے تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

اس تعداد کے ساتھ ذرا اُن ناجائز پیدائشوں پر بھی غور کیجیے جو نگاہوں سے مستور رہتی ہیں اور پھر ذرا لاتعداد حادثات کا بھی تصور کیجیے جو اسقاط کے رہین منت ہیں۔ ایک مسلم معاشرے میں زناکاری اور بدکاری کے اس بڑھتے ہوئے سلسلے کے بارے میں جب انسان سوچتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بے اختیار ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ آج ہم اخلاقی انحطاط کے مہیب غاروں میں کتنی برق رفتاری کے ساتھ دھکیلے جا رہے ہیں۔

یہ تشویشناک صورتِ حال یونہی تو پیدا نہیں ہو گئی اس کے پیچھے بعض نہایت خطرناک محرکات کام کر رہے ہیں۔ اس میں سب سے پہلا محرک دین سے ایک عام بے پروائی کا خطرناک رجحان ہے۔ مذہب اخلاق کی بنیاد ہے۔ مذہب کے بغیر انسانی سیرت و کردار میں کبھی پختگی نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے اندر اخلاقی حس صرف اُسی صورت میں بیدار رہتی ہے جب کہ اس کا باطن زندہ جاوید علیم و خبیر اور قادرِ مطلق ذات پر ایمان سے معمور ہوتا ہے اور وہ اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کو ہی اپنی سب سے بڑی کامیابی اور اس کی ناراضگی کو ہی اپنی سب سے بڑی ناکامی خیال کرتا ہے۔ جب اُس کے ذہن میں یہ تصور پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ ایک چشم ہمہ بین اس کی ساری حرکات و سکنات

بلکہ اس کے دل کی انجان گہرائیوں میں اُبھرنے والے احساسات کو بھی اچھی طرح دیکھ رہی ہے اور وہ اسے اچھے اور بُرے خیالات اور اعمال کی جزا و سزا دینے پر قدرت بھی رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی جماعت کا اخلاقی قانون اور اس کے تادیبی ضابطے ایک حد تک انسانی کردار کی نگرانی کرتے ہیں لیکن صرف انہی کا اثر انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہوتا ہے جسے انگریزی میں (DAY LIGHT MORALITY) اجالے کا اخلاق کہا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو، اور ماخوذ ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو اور قانونی شکنجہ سے بچنے کا موقع ہو تو پھر انسان بدی کر سکتا ہے۔ انسان کے احساسات و نظریات جو اس کے اعمال کے محرکات ہیں وہ تو فطری طور پر قوانین کی زد سے باہر ہوتے ہی ہیں۔ باقی رہے انسان کے ظاہری اعمال تو ان کی نوعیتیں بھی بسا اوقات اتنی پیچیدہ اور اتنی الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ قانون ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ مجرد قانون اور تادیبی ضابطوں کی مدد سے کسی معاشرے کو کبھی بھی با اخلاق نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر یہ خارجی بندشیں افراد کو گناہ سے باز رکھنے کے لیے کافی ہوتیں تو آج یورپ اور امریکہ میں جرائم کا نام و نشان نہ ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ہر قسم کی قانونی حکربندیوں اور عدالتوں کے بڑے وسیع نظام کے باوجود جرائم کی رفتار بڑی تشویشناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے جریدہ ٹائم میں جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے قانون کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

- گزشتہ سال امریکہ میں چھبیس لاکھ مختلف نوعیتوں کے نہایت سنگین جرائم کی پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔
- ہر بارہ سیکنڈ میں مغربی تہذیب کے اس گہوارہ میں ایک وحشتناک جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔
- ہر ڈھائی منٹ کے اندر قتل، قاتلانہ حملے یا زنا بالجبر کی ایک واردات ضرور ہوتی ہے

- ہر پانچ منٹ میں ڈاکہ زنی یا چوری کا ایک جرم ضرور کیا جاتا ہے۔
- ہر گھنٹے میں باون کاریں چرائی جاتی ہیں۔
- گزشتہ سال پولیس کے ہر دس افسروں میں سے ایک افسر شہریوں کے تشدد کا نشانہ بنا
- ۹۳۰۰۰ مجرموں میں سے جو ۱۹۶۴-۱۹۶۳ء میں گرفتار ہوئے، ۷۶ فیصد سابق سزا یافتہ تھے۔

جرائم کے یہ اعداد و شمار وہ ہیں جو پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ جو لوگ احتساب سے بچ گئے ہیں اُن کی تعداد اگر ان سے تگنی نہیں تو دُگنی ضرور ہو گی۔

یہ اس ملک کا حال ہے جو دَورِ حاضر کی تہذیب و شائستگی کی امامت کا دعویدار ہے۔ جس میں روپے کی ریل پیل ہے، جس میں خواندگی کا تناسب ۹۵ فیصد ہے اور جس میں شہریوں اور حکام کی تعلیم و تربیت کے نہایت اعلیٰ انتظامات موجود ہیں۔

اس صورتِ حال پر جتنا بھی غور کیا جائے آپ ایک ہی نتیجے پر پہنچیں گے کہ جب تک انسان خود اپنے نفس کا محاسب بننے پر آمادہ نہیں ہوتا اس وقت تک محض قانونی بندشیں اُسے ارتکابِ جرم و گناہ سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ صحیح معنوں میں اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر کار جانا ہے۔

ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس بدیہی حقیقت کو اہلِ مغرب بڑے تلخ تجربات کے بعد ماننے پر مجبور ہوئے ہیں اُسے ہمارے ہاں یکسر نظر انداز کر کے ایک ایسی روش اختیار کی جا رہی ہے جس سے اہلِ پاکستان کا اللہ پر ایمان اور دین سے محبت و عقیدت بڑھنے کے بجائے مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے اور پاکستان کو اسلامی تہذیب و تمدّن کا مسکن بنانے کے بجائے مغربی تہذیب کا نمونہ بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

اسلام نے عورت کے لیے جو دائرہ کار مقرر کیا ہے اور اس نے حسن و نظر کے درمیان حد بندی کا جس طرح اہتمام کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آزادی کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اپنے معاشرتی نظام کو اسلامی نقطۂ نظر سے مستحکم بناتے اور فرنگی یلغار سے اس میں جو رخنے پڑ گئے تھے انہیں بند کرنے کی پوری فکر کرتے لیکن یہاں اسلام کے معاشرتی حصار میں ڈائنا مائٹ لگا کر شگاف کیے جا رہے ہیں۔ آپ کسی اخبار کے صفحے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیں تو آپ کو نیم برہنہ عورتوں کی متعدد تصاویر ملیں گی۔ بلکہ ان اخبارات میں اس قسم کی تصاویر شائع کرنے میں ایک جذبۂ رقابت نظر آتا ہے اور ہر اخبار اپنے صفحات کو ان سے مزین کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرتا ہے۔ اس مسابقت نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ کئی ایک اخبارات اب ایسے شائع ہونے لگے ہیں جن میں عورتوں کی تصاویر اور ان کے رومانوی قصوں کے علاوہ دلچسپی کی کوئی دوسری چیز موجود ہی نہیں ہوتی۔

ان نیم برہنہ تصاویر کے علاوہ ایک اور خطرناک رجحان جسے اس ملک کے اربابِ اختیار تقویت فراہم کر رہے ہیں وہ عورتوں اور مردوں کے درمیان بے حیایانہ میل جول ہے۔ کوئی قومی تقریب ہو اس میں مرد اور عورتیں آپ کو پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ملیں گے۔ غیر ملکی مہمانوں کی آمد پر جہاں مرد ناچ گانے سے انہیں محظوظ کریں گے وہاں عورتیں بھی برابر شریک ہونگی اور وہ بھی اپنے فن کا ایک دوسرے سے بڑھ کر مظاہرہ کریں گی۔ ابھی حال ہی میں صدر جمہوریہ چین کی آمد پر مختلف مقامات میں طلبہ اور طالبات نے رقص و موسیقی کی محفلیں سجا کر حسن مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے اُسے دیکھنے کے بعد بھی آنے والے طوفان کے خطرات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مسلمان خواتین جو کبھی اتنی باحیا اور باغیرت ہوا کرتی تھیں کہ انہیں غیر مرد سے معمولی بات چیت کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی تھی وہ آج غیر ملکی فنکاروں سے اپنے حسن کی داد وصول کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ پیرس کے مشہور جامہ تراش مسٹر پیئر کارڈین نے، جو ایئر ہوسٹس یونیفارم ڈیزائن کے مقابلے

کے سلسلے میں پاکستان آئے تھے جس بے تکلفی کے ساتھ پاکستانی خواتین کے حسن کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں اور جس جذبۂ افتخار کے ساتھ ان عورتوں نے انہیں سراہا ہے، اسے دیکھ کر انسان یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔

عورتوں کے اندر نمائش کے اس حد سے بڑھے ہوئے جذبے نے اچھے اچھے دین پسند گھرانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے۔ وہ بیچارے سمجھ نہیں پاتے کہ آخر اس سیلاب کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اب لڑکیاں عفت اور پاکبازی کا پیکر بننے کے بجائے ایکٹرس بننے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں اور نمائش کا یہ جذبہ انہیں ایسی بُرائیوں کی طرف لے جاتا ہے جن سے بیچاری شرافت مارے شرم کے منہ چھپا لیتی ہے۔ ماں باپ کے لیے بے حیائی کا یہ خوفناک رجحان جس قدر پریشان کن ہے اُس کی ایک معمولی سی جھلک مندرجۂ ذیل خط میں دیکھی جا سکتی ہے جو ایک ماں نے ایک ماہنامے کے مدیر کو لکھا ہے:

"میری لڑکی کی عمر ساڑھے سترہ سال ہے۔ اچھی خاصی قبول صورت ہوتے ہوئے بھی حد سے زیادہ میک اپ کرتی ہے۔ بچپن کے لاڈ پیار نے اُسے نڈر بنا دیا ہے۔ یہ عادت اُسے قریباً پندرہ برس کی عمر سے پڑی۔ آج کل وہ ایف اے کی طالبہ ہے۔ کالج میں آنے کے بعد سے اُس کی حرکات کچھ مشکوک سی ہو گئی ہیں۔ کچھ عرصے سے مَیں نے اس کے جیب خرچ میں کمی کر دی ہے، لیکن وہ پھر بھی قیمتی پوڈر اور کریم وغیرہ لاتی رہی۔ اس کی سہیلیاں بھی مجھے اچھی سوسائٹی کی معلوم نہیں ہوئیں۔ مَیں نے اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا شروع کی تو معلوم ہوا کہ میری لڑکی اور اس کی سہیلیاں روزانہ ایک ایسی جگہ جاتی ہیں جہاں پہلے سے غنڈے موجود ہوتے ہیں۔ اب خود سوچ لیں کہ کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔ بہت کوشش کی کہ لڑکی مان جائے، مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، وہ کسی طرح باز نہیں آتی۔ روزانہ

نماز پڑھ کر دُعا کرتی ہوں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی اثر نہیں رکھتی "۔

مانا کہ اس بچی کو آغاز میں بے جا لاڈ پیار نے بگاڑا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اُسے ذرا سی ڈھیل فوراً بے حیائی کے عین منجدھار میں کیوں بہا کر لے گئی؟ اور اُس نے تعلیم و تربیت کے گہواروں میں جہاں اُس نے اپنی قیمتی زندگی کے ۱۲ سال صرف کیے ہیں، اپنے اخلاق کو سنوارنے کے بجائے انہیں برباد کرنے کا درس ہی حاصل کیا؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سکول اور کالج تعلیم و تعلّم جیسے مقدس کام کو تیاگ کر اب مغربی معاشرت کے علمبردار بنتے جا رہے ہیں۔ جہاں انہیں اچھے اخلاق کا سبق ملنے کے بجائے فنونِ لطیفہ کی آڑ میں باقاعدہ آبرو باختہ بنایا جاتا ہے۔ اساتذہ کرام کی نگرانی میں مبتذل اور فحش ڈرامے اکثر سٹیج کیے جاتے ہیں۔ پھر تصویر کھچوانے کے مرض نے جو جذبہ نمائش ہی کی ایک صورت ہے، ایک خوفناک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ طالبات کی تصویریں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں۔ سکولوں اور کالجوں میں کوئی معمولی سے معمولی تقریب بھی ایسی نہیں ہوتی جو فوٹو گرافر کے بغیر منعقد ہو سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری طالبات ہر کام، خواہ وہ ناچ گانے کی محفل ہو، مجلسِ مذاکرہ ہو، مشاعرہ یا مقابلۂ حسنِ قرأت ہی کیوں نہ ہو صرف اخبارات میں اپنی فوٹو شائع کروانے کے لیے ہی کرتی ہیں۔

اس اخلاقی بگاڑ کی ایک بڑی وجہ مخلوط تعلیم بھی ہے جہاں نوجوان بچّے اور بچیاں بڑی آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بڑے بے حجابانہ انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس بنا پر اس سنگین صورتِ حال کی اصلاح کے لیے سب سے پہلا اور مؤثر قدم یہ ہے کہ اس نظام کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ شکنی کی جائے اور بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا الگ الگ انتظام کیا جائے لیکن ہمارے ہاں جن لوگوں پر اس صورتِ حال کی

اصلاح کی براہِ راست ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ مغرب پرستی کے اس خطرناک رجحان کو روکنے کے بجائے اُسے ملک کے لیے سراپا خیر سمجھتے ہوئے اُسے جلد از جلد غالب بنانے کی فکر میں ہیں۔

ابھی چند روز ہوئے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس میں طلبہ کے مسائل کا جائزہ لیکر حکومت کو انہیں حل کرنے کے لیے مشورے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس میں تعلیم نسواں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس سے برسرِ اقتدار طبقے کے فکری رجحانات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں مخلوط تعلیم کی حمایت کا جذبہ کار فرما ہے اور طالبات کے لیے الگ یونیورسٹی کے قیام پر بحث کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ کمیشن اس میں کوئی حقیقی جواز نہیں پاتا۔ (ص ۱۴۵)

ہمارے ہاں بگاڑ کی رفتار پہلے ہی بڑی تیز ہے مگر اس میں ٹیلی ویژن کے آجانے کے بعد غیر معمولی اضافے کی پوری توقع ہے۔ پردۂ فلم کے ساتھ جن اخلاقی برائیوں کی تشہیر روزمرہ کا معمول بن گئی ہے اب انہی معائب کو ٹیلی ویژن کے پردے پر لانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ابھی فلموں کے حیا سوز پہلو ٹیلی ویژن کے پردے پر اُسی شدت کے ساتھ نہیں آ رہے تاہم سوقیانہ بولوں والے گیتوں اور کولھے مٹکانے والی رقاصاؤں کے ٹیلی ویژن پروگرام شروع ہو گئے ہیں۔ یہ رجحان اگر اس طرح بڑھتا رہا اور اس مفید ایجاد کو اخلاقی اصلاح اور تعلیمی معیار بلند کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے برائیاں پھیلانے کے لیے بے دریغ استعمال کیا جاتا رہا تو نشر و اشاعت کا یہ آلہ فلموں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو گا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ اخلاقی معائب کی تشہیر کا جو سیلاب امڈے گا وہ گھروں کی چار دیواری کے اندر بڑی خوفناک تباہی مچائے گا اور جو گھرانے ابھی تک فلم کی مضرتوں سے محفوظ ہیں وہ بھی اس لپیٹ میں آجائیں گے۔

(باقی صفحہ پر)

اسلام میں نظامِ احتساب

(۱)

ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی

ترجمہ : عبدالحمید صدیقی

اسلام کی دو بنیادی خصوصیات | نوعِ بشری آغاز سے لے کر آج تک جتنے الہامی اور غیر الہامی مذاہب سے روشناس ہوتی ہے اُن کی روشنی میں اگر مختلف ادیان کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اسلام میں دو ایسی نمایاں خصوصیات ملتی ہیں جو اسے دوسرے مذاہب سے ممیز اور ممتاز بناتی ہیں۔ پہلی خصوصیت دینِ حق کی ہمہ گیری اور اس کے مختلف شعبوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔ مثلاً اس کے وسیع اور متوازن نظام میں جہاں روح کی بالیدگی کا پُورا انتظام موجود ہے وہاں مادی زندگی کی ضروریات اور ان کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ تزکیۂ نفس اور انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا بھی پُوری طرح خیال رکھا گیا ہے اور اگر ایک طرف عبادات کو روحانی ترقی کی اساس قرار دیا گیا ہے تو دوسری طرف دنیاوی معاملات کی رفیع الشان عمارت بھی اخلاق کی محکم اور مستحکم بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ فرد اور جماعت کے حقوق میں ہر لحاظ سے مطابقت اور توازن ہے اور کسی ایک کے لیے دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اسلامی تعلیمات کے اسی تابندہ اور درخشندہ پہلو کو ہم یُوں بیان کر سکتے ہیں کہ دینِ حق نے انسان کے لیے ایک ایسے واضح اور روشن راستے کی نشاندہی کی ہے جس پر گامزن ہو کر وہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام نے ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل کی ہے جس کے سارے افراد خوشی اور غم میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھاتے ہیں اور بُرائی اور بے حیائی کے کاموں

سے روکتے ہیں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران - ۱۰۴)	تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔
وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ - ۷۱)	مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اسلام کا آفاقی نقطۂ نظر اسلام کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کا وہ آفاقی نقطۂ نظر ہے جس کے مطابق وہ پوری نوعِ بشری کو ایک ایسی برادری کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس کا ہر فرد دوسرے کا دمساز، رفیق اور دلسوز خدائی ہو، جس میں انسانوں کے درمیان اونچ نیچ کی کوئی تفریق نہ ہو اور عزت و فضیلت کا معیار صرف نیکی اور پاکبازی ہو، جس میں تمام انبیاء علیہم السلام کو ایک ہی مشن کے علمبردار کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اس وجہ سے سب کو صحیح اور برحق مان کر عزت و احترام کا مستحق سمجھا جائے۔ پھر انسانیت کا یہی وسیع تر نقطۂ نظر پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات میں کارفرما ہے اور اسی بنا پر اسلامی معاشرے میں عدل و انصاف، نیکی اور پرہیزگاری کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔ یہی نقطۂ نظر ایک مسلمان کے دل میں یہ احساس بھی بیدار کرتا ہے کہ حکمت اور بھلائی کی بات اُسے جہاں سے بھی ملے اُسے اپنی گمشدہ متاع سمجھ کر فوراً حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور دینِ حق کے سرمدی پیغام کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے۔ یہ غالباً اسلام کی اسی انسانیت دوستی کا اعجاز ہے کہ اس نے جس تہذیب و تمدن کی تشکیل کی ہے اس میں انسانیت کے سارے صالح عناصر پوری طرح شامل ہیں۔

اخلاقی عظمت۔ قرآن مجید میں بےشمار آیات اجتماعی فضائل، راستی اور عدل کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ان انفرادی اور اجتماعی اخلاق میں والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک،

ضرورتمند اعزہ واقارب، یتیموں اور مسکینوں کی معاونت اور دستگیری، محتاجوں اور ناداروں کی حاجت براری، مریضوں اور کمزوروں کے ساتھ شفقت اور نرمی کا برتاؤ، لوگوں کی دست درازیوں سے درگزر کرنے اور صلۂ رحمی کی عادت، مصائب کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے، اور حق وصداقت کے کٹھن راستے پر قائم رہنے کی سچی تڑپ، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کا سچا جذبہ، رزقِ حلال کے حصول کے لیے سعی وجہد، یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے فضائل اسلامی نظامِ حیات میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

قرآن مجید نے جہاں ایک طرف ان مثبت اخلاقی اقدار کو اپنانے کی تلقین کی ہے وہاں منکرات سے اجتناب پر بھی بڑا زور دیا ہے اور ان برائیوں کا واضح ذکر فرمایا ہے جو انسانی اخلاق کو بگاڑنے اور برباد کرنے والی ہیں۔ مثلاً فحش گفتگو، سوءِ ظن، دروغ، خیانت، ظلم وعدوان، اکلِ حرام، یتیموں اور بے سہارا لوگوں کا مال خُرد بُرد کرنا، ناپ تول میں بددیانتی کرنا، اور خرچ کے معاملے میں اسراف سے کام لینا۔ ان کھلی برائیوں کا ذکر احادیث نبوی اور آثارِ صحابہ میں بھی ملتا ہے اور حضورؐ سرورِ دوعالم اور ان کے مقدس رفقارِ کار کے اقوال وافعال سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رذائل کو کس نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اسلام میں نظامِ احتساب کی اہمیت نظامِ احتساب اسلام میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خدائی فرمان کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور اس کی مدد سے انفرادی اور اجتماعی اخلاق کو عدل وانصاف اور حق وصداقت کی بنیاد پر استوار کیا جاتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اس نظام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت کھل کر آجاتی ہے کہ یہ نظامِ احتساب اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے بالکل فطری طور پر اس کے بطن سے جنم لیا ہے، شرعی قوانین وضوابط نے اسے قوت وتوانائی بخشی ہے اور اسلامی تہذیب وتمدن کی آغوش میں یہ پل کر جوان ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسلم مفکرین جیسے ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ)، ابن الاخوۃ (متوفی ۷۲۹ھ)، اور ابن خلدون (متوفی

نے اس محکمۂ احتساب کو دینِ حق کا ایک اہم ترین فرض اور نظامِ اسلامی کا ایک نہایت ضروری شعبہ قرار دیا ہے۔

احتساب کیا ہے؟ لسان العرب کی تحقیق کے مطابق حُسبَۃً مصدر ہے جیسے احتسابک الاجر علی اللہ اللہ سے اس کام کے اجر کی امید رکھنا۔ اسی لئے یہ بھی کہا جاتا ہے فعلتہ حسبۃً میں نے یہ کام اجر کی امید پر کیا چنانچہ عربی میں احتساب طلبِ اجر کے معنوں میں مستعمل ہے اور اس کا اسم الحسبۃ اجر کے مترادف ہے جیسے احتسب فلان علی فلان یعنی فلاں نے فلاں پر احتساب کیا یعنی اس کی کسی برائی پر ٹوکا اور منع کیا یا وردی کے قول کے مطابق یہ لفظ امر بالمعروف کے لئے آتا ہے جب کہ لوگوں نے نیکی اور بھلائی کی راہ ترک کردی ہو یا نہی عن المنکر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جب وہ برائی کا ارتکاب کر رہے ہوں۔

امام غزالیؒ کا ارشاد ہے کہ یہ لفظ اللہ کے حق کے لئے کسی بُرائی کو ٹوکنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ جس شخص کو ٹوکا جائے اسے بُرائی کے ارتکاب سے باز رکھا جائے۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ حضور سرورِ دو عالم اور آپ کے پاکباز خلفاء اور اُمت کے آئمہ وصلحا عوام کو امور دینوی اور دنیاوی، دونوں کے بارے میں رہنمائی دیتے رہے۔ وہ انہیں نیکی اور بھلائی اختیار کرنے کی تلقین کرتے اور بُرائی سے روکتے اور یہ سلسلہ احتساب کا ایک الگ منصب وجود میں آنے سے پہلے قریب قریب دو صدیوں تک قائم رہا۔ احادیث کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور سرور کائنات اور آپ کے خلفاء نے تجارت کی نگرانی کے لیے بعض تجربہ کار افراد کو بطور محتسب مقرر فرمایا۔ حضورؐ نے جن حضرات کو یہ فرض سونپا اُن میں حضرت سعید بن سعید بن العاص بن امیہ مشہور ہیں جنہیں مکہ کی منڈیوں کا نگران مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کام السائب بن یزید اور عبداللہ بن عتبہ کے سپرد فرمایا اور مدینہ کی منڈیوں کی دیکھ بھال اُن کے ذمّے لگائی گئی۔

دوسری صدی ہجری کے نصف میں جب عباسی دور شروع ہوا اور سلطنت کی حدود کافی پھیل گئیں اور صنعت و تجارت کو غیر معمولی ترقی ہوئی تو احتساب کا ایک الگ محکمہ قائم کرنا

پڑا۔ اس سلسلہ میں ہمیں جو مستند معلومات حاصل ہیں ان کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس محکمہ کی باقاعدہ تشکیل خلیفہ ابوجعفر المنصور کے عہد میں اُن کے حکم سے کی گئی اور انہوں نے منڈیوں اور بازاروں کے حالات کی نگرانی کے لیے خطیب بغدادی کے قول کے مطابق یحییٰ بن ذکریا کو مقرر کیا۔ بعد میں وہ اس سے ناراض ہوگیا اور اسے قتل کروا دیا۔

ابوالفداء نے ۱۶۹ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم خلیفہ الہادی کے عہد میں بطور محتسب کام کرتے تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء علوم الدین میں خلیفہ مامون کے ایک "محتسب" کا واقعہ درج کیا ہے جس نے بادشاہ کے حکم کے بغیر ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینا شروع کر دیا تھا۔ اُسے مامون نے اپنے دربار میں بلایا اور اس جسارت پر سرزنش کی۔ اسی دوران خلیفہ مامون کے ہاتھ سے ایک کتاب گر کر اس کے قدموں میں جا پڑی۔ اُس محتسب نے اس حرکت پر گرفت کی۔ بادشاہ نے وہ کتاب بڑے احترام سے اٹھائی اور پھر اُس شخص کو مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم ہمیں معروف کا کیوں حکم دیتے ہو۔ یہ تو ہمارے بنیادی فرائض میں داخل ہے اور ہم وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

خلیفہ کی یہ بات سن کر محتسب نے کہا[1]: آپ جو کچھ فرما رہے ہیں یہ صحیح اور درست ہے تسلط اور حکومت کی حقیقت وہی ہے جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے۔ ہم اس معاملے میں آپ کے مدد و معاون بننا چاہتے ہیں اور ہم باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی آپ کا احتساب کرتے ہیں۔

---

[1] فاضل مقالہ نگار نے احیاء العلوم کی جو عبارت نقل کی ہے وہ اصل متن سے قدرے مختلف ہے ہم یہاں اصل عبارت کا ترجمہ دے رہے ہیں۔ دیکھیے المحتسب فی الامر بالمعروف و شروطہ جلد دوم ص ۳۱۳

کیا آپ کے سامنے مالک الملک کا یہ ارشاد نہیں:

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (التوبہ - ۷۱)

کیا تمہاری نگاہ حضور سرورِ کائنات کے زرّیں قول پر نہیں پڑی:

المومن للمومن کالبُنیان یشدّ بعضهٗ بعضاً — ایک مسلمان دوسرے کے لیے مثل عمارت کے ہے۔ اس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت دیتا ہے۔[1]

تمہیں خدائے بزرگ و برتر نے زمین میں حکومت عطا کی ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں تمہارے اور ہمارے سامنے ہیں اگر تم اُن کے مطابق عمل کرو گے تو ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔ جو شخص تمہیں اللہ اور اُس کے رسول کے فرمان کے مطابق ٹوکتا ہے وہ درحقیقت تمہاری اعانت کرتا ہے تمہیں اس کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

ابن خلدون کی تحقیق کے مطابق شمالی افریقہ اور اندلس میں احتساب کا شعبہ محکمہ قضا کا ایک حصہ تھا اور قاضی اپنے اختیار سے اس کام کے لیے جس شخص کو موزوں سمجھتا تعینات کر دیتا یہی صورتِ حال مصر میں بھی تھی۔ بعد میں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے۔

ماوردی وہ پہلے اسلامی مفکر ہیں جنہوں نے نظامِ احتساب پر ایک جداگانہ شعبے کی حیثیت سے سیر حاصل بحث کی ہے اور عدلیہ اور محکمہ شکایات سے الگ ایک مستقل محکمے کی صورت میں اس کا جائزہ لیا ہے اور ان تینوں محکموں کے جو الگ الگ وظائف ہیں ان کی بڑی دیدہ وری سے نشاندہی کی ہے۔ اُن تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم پانچویں صدی ہجری میں یہ محکمہ مشرق میں قضا سے ایک الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔

محمد کرد علی نے اپنے رسالہ "المقتبس" میں یہ بتایا ہے کہ یہ نظامِ احتساب دوسری صدی

---

[1] یہ حدیث بخاری و مسلم میں بروایت ابی موسیٰ اشعری درج ہے۔ (مترجم)

سے لے کر تیسری صدی کے نصف تک دو شعبوں میں منقسم تھا۔ دینی شعبہ اور معاشرتی شعبہ۔ جب تک مسلمان حکومتیں دین کی خدمت اپنا فرض منصبی سمجھتی رہیں اُس وقت تک احتساب کے یہ دونوں شعبے پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہے لیکن جب انہوں نے اپنی دینی ذمہ داریوں کو پس پُشت ڈال دیا تو مذہبی شعبے میں بھی اضمحلال پیدا ہوا۔ تمدنی اور معاشرتی شعبہ بہرحال تیرھویں صدی کے نصف تک کسی حد تک اپنا فرض انجام دیتا رہا۔ سلطنت عثمانیہ میں بعض مقامات پر اس محکمہ کے لیے نگراں مجالس قائم کی گئیں۔ تونس میں یہ مجلس دس ارکان پر مشتمل تھی اور اس کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ وہ منڈی میں خیانت کرنے والوں کا سختی سے احتساب کرے، اچھے اور ناقص مال کی چھان پھٹک کرے اور بائع اور مشتری میں اگر کسی معاملے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اس کا تصفیہ کرائے۔ اس مجلس کے ارکان یہ فرض بغیر کوئی معاوضہ لیے ادا کیا کرتے تھے اور انہیں نظامِ حکومت میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ وہ ملک کی پوری تجارت کے نگران خیال کیے جاتے تھے۔ گورنر خود بعض امور کو سلجھانے کے لیے اُن سے مشورہ کرتا۔ حاکم شہر اس مجلس کی کارکردگی کا پوری طرح جائزہ لیتا۔ اس مجلس صنعت و تجارت کا صدر مختلف پیشوں کی انجمنوں کی بھی صدارت کرتا تھا۔ اگر کارخانہ داروں میں کسی بات پر اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کا فیصلہ آخری اور حتمی خیال کیا جاتا جس کے خلاف کسی قسم کی کوئی اپیل نہ کی جا سکتی تھی۔ پھر اس مجلس تجارت کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ جب کوئی شخص دیوالیہ ہو جائے تو اس کے مال کو ضبط کرائے، پھر اُسے فروخت کرے اور قرض خواہوں کو اُن کے حصے کے مطابق وصول شدہ رقم تقسیم کرے۔ اس کے علاوہ مختلف بستیوں اور محلوں کے چوہدری اس بات کے پابند تھے کہ وہ ہر ماہ اپنی اپنی بستی اور محلے میں پیدائش اور موت کی رپورٹ پیش کریں۔

تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں، خواہ ان کا تعلق کسی ملک سے ہو، نظامِ احتساب کو اچھی خاصی اہمیت حاصل رہی اور اس موضوع پر انہوں نے نہایت وقیع اور

گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم تصنیف ماوردی کی الاحکام السلطانیہ ہے، امام غزالی نے بھی اپنی مشہور کتاب احیاء علوم الدین میں اس نظام پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے قدیم اور جدید اہلِ علم نے اسلامی نظامِ حیات میں محکمہ احتساب کی اہمیت اور اس کی نوعیت اور فرائض پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ کتب اسلامی تمدن کے ارتقاء کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے دین اور اخلاق کی بنیاد پر صنعت و حرفت میں کس قدر عروج حاصل کیا اور پیدائش کے مختلف طریقوں (METHODS OF PRODUCTION) میں کون کونسی جدت طرازیاں کیں اور اُن میں کس قدر چابکدستی اور مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ صنعت و تجارت میں فریب کاری کے انسداد کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ پھر اس نظامِ احتساب کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ نئے الفاظ وضع کیے گئے اور نئی نئی تراکیب تیار ہوئیں جن کی وجہ سے عربی زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔

احتساب جیسا کہ میں نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے اپنی اصل کے اعتبار سے امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا ہی دوسرا نام ہے اور اس مقدس فرض کی انجام دہی مسلمانوں پر لازم ہے۔ قرآن مجید کی آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتی ہیں کہ کوئی کامیاب اجتماعی زندگی اس بنیادی فرض کو ادا کیے بغیر گزاری نہیں جا سکتی۔ معاشرے کے ہر فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو خیر اور بھلائی کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرے اور برائی کا پوری قوت سے راستہ روکے۔ اسی بنا پر یہ فریضہ ہر عاقل مسلمان پر جو اس کے ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، عائد ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ نے اس معاملے میں فاسق، غلام اور عورت کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا بلکہ انہوں نے فرمایا ہے کہ اولاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ماں باپ کی، غلام اپنے آقا کی، بیوی اپنے خاوند کی، شاگرد اپنے استاد کی، رعیت اپنے حکام اور فرمانرواؤں کی اصلاح کی فکر کرے اگرچہ اس فرض کی ادائیگی

میں حالات و حفظِ مراتب کے فرق کی وجہ سے تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس کام سے کسی کو مفر نہیں۔ احتساب حکومت کے بنیادی فرائض میں داخل ہے لیکن یہ ایک نہایت ہی اہم معاشرتی ذمہ داری بھی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق حیاتِ انسانی کے کسی ایک گوشے سے نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کے لیے ایک راہنما اصول ہے جس کی مخلصانہ پیروی سے معاشرے میں خیر و برکت پیدا ہوتی ہے۔

دین نام ہے اللہ کے حقوق کی ادائیگی کا جو اُس نے انسانوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ اللہ کے حقوق دوسرے تمام حقوق پر فائق ہیں اور انہیں کسی بڑی سے بڑی مصلحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی انفرادی اور اجتماعی مطالبہ دینی مطالبے پر بھاری نہیں ہو سکتا۔ دین انسان کے افکار و نظریات کی تشکیل اور احساسات و جذبات کی تربیت کرتا ہے اور اس بنا پر وہ انسان کو ہر قسم کی خارجی جکڑ بندیوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ دین کا دار و مدار احساس و ضمیر کی بیداری پر ہے اور یہ گوہر مقصود باری تعالیٰ سے گہری محبت اور اس کے احکام کی خوشدلانہ پیروی ہی سے ہاتھ آتا ہے اور یہ پیروی زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود نہیں بلکہ جب تک انسان پُوری طرح اللہ کی منشا اور مرضی کے تابع نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ اسلام کی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا فریضہ جسے ہم "الاحتساب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ بھی باری تعالیٰ کی عبادت ہی میں شامل ہے۔ اس سے ضمیر کی بیداری وابستہ ہے کیونکہ جب تک انسان ہر وقت اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ نہیں رہتا اس وقت تک وہ اس فریضۂ احتساب کو اچھی طرح سرانجام نہیں دے سکتا۔ امام ابن تیمیہؒ نے نظامِ احتساب کے نگراں کی جملہ ذمہ داریوں میں سے نماز کی نگرانی کی ذمہ داری کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے کیونکہ نماز نیکی اور بھلائی کی تمام صورتوں میں سے سب سے زیادہ نمایاں اور اہم صورت ہے۔ یہ درحقیقت اسلام کا ستون اور نظامِ شریعت کا بنیادی پتھر ہے۔ معاشرے میں بے حیائی اور بُرائی کے استیصال کا نماز سب سے موثر ذریعہ ہے۔ خود باری تعالیٰ نے نماز کا ذکر

کرتے ہوئے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ۔ تحقیق نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ (العنکبوت - ۴۵)

محتسب اجتماعی اخلاق کا نگران ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقوق اللہ کی بجا آوری کے لیے ترغیب و ترہیب سے کام لے۔ مثلاً یہ بات اُس کے لیے بالکل جائز ہے کہ وہ ان مقامات پر نماز جمعہ کی ادائیگی کا بھی انتظام کرے جہاں چالیس سے کم مسلمان آبادی موجود ہو۔ اور اس معاملے میں اگر کوتاہی سرزد ہو تو تادیب کرے[1]۔ تاکہ مسلمانوں میں جمعہ کے بارے

---

[1] فاضل مقالہ نگار نے بات کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش فرمایا ہے کہ اس سے غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہے اس لیے یہاں ہم ماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ کی پوری عبارت نقل کر دیتے ہیں:

"اگر کسی بستی میں اتنے آدمی ہوں کہ بالاتفاق ان میں جمعہ منعقد ہو سکتا ہو مثلاً چالیس یا اس سے زائد تو محتسب اسے قائم کرنے پر لوگوں کو مجبور کرے اور کوتاہی کی صورت میں تادیب کرے۔ اگر چالیس سے کم ہوں اور ان میں جمعہ منعقد ہونے میں اختلاف ہو تو اس کی چار حالتیں ہیں پہلی حالت یہ ہے کہ محتسب اور قوم کے فقہی مسلک کے مطابق جمعہ منعقد ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں محتسب پر واجب ہو کہ وہ انہیں اس کے انعقاد کا حکم دے اور ان سے اس کی تعمیل کروائے اور جو لوگ اس معاملے میں تساہل سے کام لیں ان سے باز پرس کرے لیکن اس ضمن میں یہ احتیاط ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھے کہ باز پرس کی نوعیت اور شدت وہ نہ ہونی چاہیے جتنی کہ بالاجماع وجوب کے تارکین کے لیے ضروری ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ محتسب اور عام آبادی دونوں کے نزدیک اتنی کم تعداد سے جمعہ منعقد نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں ایسا حکم دینے سے پرہیز کرے بلکہ اگر لوگ منعقد کرنا چاہیں تو انہیں اس سے باز رکھے۔ تیسری حالت یہ ہے کہ قوم کے نزدیک منعقد ہو سکتا ہو اور محتسب کے نزدیک نہ ہو۔ اس صورت میں اُسے تعرض نہ کرنا چاہیے۔ چوتھی حالت یہ ہے

میں ایک عام لاپرواہی نہ پیدا ہونے پائے اور ان کی آئندہ نسلیں قلتِ تعداد کی طرح کثرتِ تعداد کی صورت میں بھی جمعہ کو ساقط نہ سمجھنے لگیں۔ پھر محتسب کا یہ حق ہے کہ وہ اس بات کی کڑی نگرانی کرے کہ مسلمان اول وقت فرض نمازیں ادا کرتے رہیں۔ تاخیر کی صورت میں بچوں کے نیم پختہ ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں ہونے کا اندیشہ ہے کہ نماز کے لیے موخر وقت ہی صحیح اور درست ہے اور اول وقت جائز اور مناسب نہیں۔ اس کے فرائض میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ مسلمانوں کی نگرانی کرے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں میں کہیں کوتاہی نہیں کر رہے ہیں۔

محتسب کا فرض ہے کہ مسلمانوں کے اندر فکر و عمل کی جو کمزوریاں پیدا ہو رہی ہوں اُن کا محاسبہ کرے کیونکہ یہ کمزوریاں جب ایک مرتبہ انسان کے دل و دماغ میں راہ پاکر اُس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں تو پھر انہیں دُور کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ خاص طور پر بچوں کو تو ان اخلاقی وباؤں سے بچانے کی پوری فکر کرنی چاہیے۔ محتسب کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور عوام کے اندر فکرِ صحیح اور عملِ صالح کے فروغ کا التزام کرنا چاہیے۔

جو شخص احتساب کے بلند اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنے اندر اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ جلیلہ پیدا کرے جیسے رحم، حلم، صبر۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الحسبۃ فی الاسلام میں فرمایا ہے کہ جب تک انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریوں اور اس کام کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا اس وقت تک اُسے یہ ذمہ داری اپنے ہاتھ میں نہ لینی چاہیے۔ اُسے اچھی طرح اُن اسباب وعلل کو جاننا چاہیے جن کی وجہ سے بداخلاقی

کہ محتسب کے نزدیک اتنے افراد سے جمعہ کا انعقاد ضروری ہو اور عوام اسے ضروری نہ سمجھتے ہوں۔ اس صورت میں باوجود امتدادِ زمانہ اور افراد کی کمی بیشی کے جمعہ کا ترک بالاستمرار لازم آتا ہے تو کیا ایسی حالت میں محتسب انعقادِ جمعہ کے لیے لوگوں کو مجبور کرسکتا ہے یا نہیں۔ علمائے شافعیہ کے دو قول ہیں ایک یہ ہے اور یہی ابو سعید اصطخری کے قول کا اقتضا ہے کہ بلحاظ مصلحت انعقاد کا حکم کرسکتا ہے تاکہ آئندہ نسلیں قلتِ عدد کی طرح کثرتِ عدد کی صورت میں جمعہ کو ساقط نہ سمجھنے لگیں۔

ص ۲۱۱

کمزوریاں کسی معاشرے میں پھیل رہی ہوں اور پھر ایک دمساز رفیق اور دلسوز رفاقی کی حیثیت سے بڑے صبر اور حکمت و دانائی کے ساتھ انہیں دُور کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

محتسب کے فرائض میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ وہ اساتذہ کو بچوں سے ایسے ذاتی کام لینے کی ممانعت کرے جو اُن کے والدین کے لیے عار ہوں۔ پھر اُسے اس بات کی بھی نگرانی کرنی چاہیے کہ جن لوگوں کو بچوں کو سکول لے جانے اور واپس لانے کا کام سپرد کیا گیا ہے وہ پاکباز، دیانتدار اور قابلِ اعتماد ہوں اور بچوں کے لیے عملی اعتبار سے اخلاق کے اچھے نمونے پیش کر سکیں۔

محتسب کو اس بات کا بھی جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اساتذہ بچوں کو لغو اور بیہودہ کلام سے اپنی زبانوں کو آلودہ کرنے سے باز رکھ رہے ہیں یا نہیں۔ اور کیا وہ اس بات کا اہتمام کر رہے ہیں کہ نوخیز نسلیں اپنے والدین کے ساتھ شائستگی سے پیش آئیں۔ اور اُن کے احکام کی اطاعت کریں۔ پھر محتسب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اساتذہ کا طلبہ کے ساتھ طرزِ عمل کا بھی جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ وہ انہیں سخت ایذا تو نہیں دیتا۔

لونڈیوں اور غلاموں کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی بھی اسلامی ریاست میں محکمہ احتساب کے ذمے ہوتی ہے۔ اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھے کہ کیا ان کے مالک اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں، کیا وہ ان کی طاقت اور استطاعت سے زیادہ تو اُن پر بار نہیں ڈالتے اور کیا وہ کھانے، پینے، لباس اور دیگر ذمہ داریوں سے اُسی طرح عہدہ برا ہوتے ہیں جس طرح کہ اسلام نے حکم دیا ہے۔

محتسب کی نازک ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ تُجّار اور کاروباری حضرات کی سیرت و کردار کی کڑی نگرانی کرے خصوصاً عورتوں کے ساتھ لین دین کرنے اور عہد و پیمان کا پاس رکھنے میں تو انہیں غیر معمولی حد تک محتاط ہونا چاہیے۔ اور جب تک اُن کے بارے میں اس بات کی پُوری طرح تصدیق نہ ہو جائے کہ وہ قلب و نگاہ کے معاملے میں پاک اور قابلِ اعتماد ہیں اس وقت تک انہیں عورتوں کے ساتھ معاملہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور اگر ان کی نیتوں

میں کھوٹ اور اُن کی نگاہوں میں میل نظر آئے تو پھر انہیں اس کام سے بالجبر روک دینا چاہیے۔
اسلام نے جہاں انسان کو انسان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی ہے وہاں
اُس نے حیوانوں کے ساتھ بھی رحم کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ
جانوروں کی دیکھ بھال، ان کے چارے پانی کا مناسب انتظام اور اُن سے اُن کی قوت و طاقت
کے مطابق کام لینے کا التزام کیا جائے۔ امام ابن تیمیہؒ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک
حدیث بیان کی ہے کہ حضورؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: کسی آدمی کے لیے گھوڑا اجر کا باعث
ہے، کسی کے لیے اپنی سفید پوشی کا ذریعہ اور کسی کے لیے یہ بوجھ ہے۔ جو شخص گھوڑے کو اس
غرض کے لیے پالتا ہے کہ اُسے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش
نہ آئے، اور وہ سواری کے معاملے میں اللہ کے حقوق کو پوری طرح ادا کرے، وہ اجر کا مستحق ہے۔
چنانچہ محتسب کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات پر پوری نگاہ رکھے کہ جب ایندھن اور بھوسہ ڈھونے
والے جانور منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں تو ذمہ دار حضرات جلد از جلد اُن کی پیٹھ سے بوجھ اُتار
لیں کیونکہ بے وجہ لدے رہنے سے انہیں خواہ مخواہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ حضور سرورِ دو
عالم نے سوائے کھانے کے لیے جانور کو حلال کرنے کے، باقی ہر نوعیت کی تعذیب سے منع فرمایا
ہے۔ ابن شیزری نے اپنی کتاب نہایۃ الرتبہ میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ قصابوں کے لیے یہ
کسی طرح جائز نہیں کہ وہ بھیڑ بکریوں کو گھسیٹیں یا انہیں کند چھری سے ذبح کریں، کیونکہ اس سے
انہیں اذیت پہنچتی ہے۔ پھر محتسب کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ کیا جانوروں کا
معالج اُن کی بیماریوں اور طریقِ علاج سے پوری طرح واقف ہے اور وہ اپنے اندر اپنی فرض
شناسی، جذبہ رحم اور خدا خوفی رکھتا ہے کہ بیماری کی اچھی طرح تشخیص کیے بغیر نہ تو فصد کھولتا ہے،
نہ کسی حصے کو کاٹتا ہے اور نہ چیرنے پھاڑنے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے ان معاملات
میں عجلت جانوروں کی ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے اور وہ بچارے اس ظلم کے خلاف کوئی
صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ احتساب میں اور کئی امور بھی شامل ہیں مثلاً

نے آداب الحسبتہ میں ایک ایسے محتسب کا ذکر کیا ہے جو کسی موذن کو مینار پر کھڑے ہو کر اذان دینے کی اس وقت تک اجازت نہ دیتا تھا جب تک کہ وہ آنکھوں پر پٹی نہ باندھ لے کیونکہ اُس کے نزدیک اس طرح اردگرد کے مکانوں کی بے پردگی کا خطرہ تھا۔

محتسب کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ گوشت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والوں کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ اُسے کسی برتن میں حفاظت کے ساتھ رکھ کر لے جائیں اور پھر اُسے رات کے وقت ڈھانپ کر رکھیں اور ہر صبح اس برتن کو بلاناغہ صاف کریں۔ اسی ضمن میں محتسب کے لیے ضروری ہے کہ وہ قصابوں کو اس امر کی بھی تلقین کرے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت جب کھال اُتاریں تو اس میں پھونک نہ ماریں ، ایسا کرنے میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اُن کی بدبودار پھونک گوشت کو خراب کر دے۔

جو نظامِ احتساب انسانی صحت اور اُس کے ذوق کے بارے میں اتنا حساس ہو اُس سے یہ قطعاً بعید نہیں کہ وہ اس بات کا بھی التزام کرے کہ حجام کم از کم لوگوں کی حجامت بناتے وقت ہر اُس چیز کے کھانے سے پرہیز کریں جس سے مُنہ بدبودار ہو جائے، جیسے لہسن، پیاز وغیرہ تاکہ اُن کے سانس لینے سے اُن کے مُنہ کی بدبو حجامت بنوانے والوں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بننے پائے۔ اس نظامِ احتساب کی بدولت بعض لوگوں کے اندر جذبۂ نفاست اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ جسم سہلانے والوں اور مالش کرنے والوں سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ یہ کام کرنے سے پیشتر اپنے ہاتھوں کو انار کے چھلکوں کے ساتھ رگڑ کر اچھی طرح صاف کریں تاکہ ہاتھ کھردرے ہو جائیں اور ملنے سے ایک تو ہر قسم کی آلائش دُور ہو اور دوسری طرف جسم بھی لذت محسوس کرے۔

محتسب کے لیے نانبائیوں کے کام کی نگرانی بھی ضروری خیال کی جاتی تھی اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ یہ دیکھے کہ یہ لوگ آٹا گوندھتے وقت منہ پر کپڑا باندھ کر، اور آستینیں چڑھا کر کام کرتے ہیں اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس بات کا ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے۔ گفتگو کرتے وقت یا چھینک آنے پر تھوک یا رینٹ آٹے کو خراب نہ کر دے۔ پھر ان نانبائیوں کو اپنی پیشانی پر پٹی باندھنے کی

بھی ہدایت کی جاتی تھی، مبادا پسینے کے قطرے آٹے میں گر جائیں۔ اگر آٹا دن کے وقت گوندھا جائے تو ایک شخص وہاں اس غرض کے لیے موجود رہنا چاہیے کہ وہ آٹے کو مکھیوں سے بچاتا رہے۔

حلوائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر وقت اپنے ہاتھ میں مورچھل رکھے اور اس کی مدد سے مٹھائی اور دوسری اشیائے خوردنی کو مگس کی یورش سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ گھی فروشوں کو چاہیے کہ وہ مال کو ڈبوں اور کنستروں کے اندر بند کر کے رکھیں تاکہ مکھیاں اور اسی طرح کے دوسرے کیڑے مکوڑے اسے نقصان نہ پہنچائیں اور نہ گرد و غبار اسے آلودہ کر سکے۔ اس احتیاط کے علاوہ حلوائیوں، شیر فروشوں اور گھی فروشوں کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ صاف ستھرے رہیں۔ اُجلا لباس پہنیں، چمچے، برتن، اور باٹ کو ہمیشہ دھو کر رکھیں۔ اسی طرح قصاب کا یہ فرض ہے کہ وہ جب گوشت کی فروخت سے فارغ ہو جائے تو جس لکڑی پر وہ گوشت کاٹتا ہے اُس پر اچھی طرح نمک کی تہ جما دے تاکہ کتے اور اسی طرح کے دوسرے جانور یا حشرات الارض اُسے چاٹنے سے پرہیز کریں۔ پھر قصابوں کو اس بات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ گوشت کے ٹکڑوں کو دکان کے اندر لٹکائیں مبادا راہگزر لوگوں کے کپڑے ان سے چھو کر داغدار ہو جائیں۔ میں نے بہت سے مغربی ممالک کا دَورہ کیا ہے اور واضح شواہد کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تمدنِ اسلامی نے اُس زمانے میں غیر معمولی کمال حاصل کیا جبکہ یورپ ظلمت کے دَور میں گزر رہا تھا۔ تہذیبِ اسلامی کے جن پہلوؤں کی طرف میں نے ان صفحات میں اشارہ کیا ہے وہ اس تہذیب کے پورے خد و خال نہیں بلکہ اس کے صرف چند گوشے ہیں۔ ابھی بے شمار گوشے ہیں جن کی نقاب کشائی کی جا سکتی ہے اور اس ضمن میں اَن گنت ایسی مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں جنہیں پڑھ کر ہم اور مغربی قارئین حیران و ششدر رہ جائیں۔ لیکن میں اب اس بحث کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو حضرات اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے آرزومند ہیں انہیں میں شیزری کی کتاب "نہایۃ الرتبہ فی الطلب الحسبۃ" کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں۔

(باقی)

مذہب اور تجدیدِ مذہب

(۴)

مذہبی بگاڑ کی مختلف صورتیں اور اس کے اسباب

(عبدالحمید صدیقی)

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان کا نظام جن محکم بنیادوں پر قائم ہے ان میں ایک تو اَن دیکھے خدا کی پرستش ہے، دوسری اُس کے منشا اور ارادہ کی وضاحت کرنے والی الہامی کتاب، اور تیسرے اس کتاب کو بنی نوع انسان تک پہنچانے والی، اور تعلیمات ربّانی کی عملی تشریح و توضیح کرنے والی وہ بزرگ و برتر ذات جسے دینی اصطلاح میں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود انسان کا روپ دھار کر اپنی تعلیمات کے عملی پہلوؤں سے انسان کو آشنا کرنے کے لیے نہیں آتا بلکہ یہ اہم ذمّہ داری اپنے رسولوں کو سونپتا ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام تعلیماتِ ربانی کے صحیح معنوں میں شارح اور امین ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف منشائے الٰہی کے اسرار و رموز انسانوں کو سمجھاتے ہیں بلکہ اُس کی بالکل صحیح تعبیر بھی اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ تشریح و تعبیر بھی تعلیماتِ الٰہی کا ایک ضروری حصّہ ہوتی ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام منشاءِ الٰہی کی وضاحت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ باری تعالیٰ کا اشارہ پا کر ہی کوئی بات فرماتے ہیں۔ اس لیے ان بزرگ ہستیوں کی تصریحات کلامِ ربانی کی من مانی تاویلات کی راہ میں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ مضبوط رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اور کوئی فتنہ جو اس حصار کی موجودگی میں منشائے الٰہی کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مذہب میں جب بھی فتنہ پردازوں نے بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے سب سے پہلے اس حصار کو توڑا جو کلام اللہ

کے گرد خود باری تعالیٰ نے قائم کر رکھا ہے اور پھر جب اس میں شگاف پیدا کر لیے تو اپنے منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہا کلامِ الٰہی میں بے دریغ تحریف کرتے چلے گئے۔

تعلیماتِ ربانی کی من مانی تاویلات کے جواز کے لیے انہوں نے سب سے پہلے عوام کے دلوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے وارث اور جانشین ہونے کی وجہ سے ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے منزہ ہیں وہ کشف کے ذریعے خداوند تعالیٰ کے منشا کو براہِ راست معلوم کر سکتے ہیں اور اُس کے رسول سے روحانی ربط پیدا کر کے اُس سے بلا واسطہ مستفیض ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے انبیاء علیہم السلام کے محرمِ راز ہونے کی وجہ سے اُن پر ایسے اسرار و رموز کھلتے ہیں جو عوام کی حدِ ادراک سے ماورا ہیں۔ اُن کی زبان فیض ترجمان سے نکلی ہوئی ہر بات درحقیقت کلامِ الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ خدا کی طرف سے القاء کی ہوئی باتوں کو ہی عوام پر آشکارا کرتے ہیں۔

آپ خود غور فرمائیے جب کچھ حضرات عوام سے یہ منوالیں کہ مذہب کے کچھ گوشے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں ان حضرات کے سوا اور کسی کو کوئی معلومات نہیں تو انہیں لوگوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر اس بات پر آمادہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی کہ وہ ان کی غیر مشروط پیروی کو ہی ذریعۂ نجات سمجھیں اور اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ارشاد کو حکمِ خداوندی سمجھ کر بلا چون وچرا قبول کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنے تقدس اور اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ قرب کے نام پر خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے اندر ایسے ایسے فتنے کھڑے کر دیئے جنہیں مدتوں تک دبایا نہ جا سکا۔

یہ بزرگ گو زبان سے یہی کہتے تھے کہ وہ خدا کے عاجز بندے اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے ادنیٰ خادم ہیں اور تعلیماتِ الٰہی کی مخصوص تعبیر کا انہیں جو حق حاصل ہے وہ بھی خدا کا احسان اور نبی کی برکت ہی ہے۔ لیکن اُن کی عملی زندگی میں اس بات کی قطعاً کوئی شہادت نہ ملتی تھی کہ

وہ فی الحقیقت خدا کے بندے اور رسول کے پیرو ہیں۔ اگر وہ فی الواقع بندگی کے مقام پر رہتے اور رسول کو ہی اپنا مطاع سمجھتے تو کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کو اور اپنے ذاتی نظریات اور تصورات کو مذہب کے اندر شامل نہ کرتے۔

ان کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ یہ حضرات اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے ہمیشہ ایک ہی دلیل پیش کرتے رہے ہیں کہ زندہ و جاوید خدا انہیں ہر بات سے خود آگاہ کر دیتا ہے اور پردۂ غیب میں چھپا ہوا رسول خود ان کے پاس تشریف لا کر ان کی بلاواسطہ معاونت اور رہنمائی فرماتا ہے۔ ان میں سے بعض بزرگ تو یہاں تک دعوے کرنے لگے کہ نبی اُن کے اندر حلول کر گیا ہے اور اس بنا پر لوگوں کو انہیں اُسی عزت و احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے جس نظر سے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا جاتا ہے اور انہیں وہی بلند و بالا مقام دینا چاہیے جس کے کہ انبیاء علیہم السلام مستحق ہوتے ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ان بے سروپا دعووں کی بنیاد عقل نہ تھی بلکہ باطنی علم اور کشف تھا۔

(۲) مذہب کے اندر رسول کے صحیح مرتبہ کو نقصان پہنچانے والے دوسرے گروہ نے ایک دوسرے انداز سے خدائی کا دعویٰ کیا۔ پہلے گروہ نے تو یہ کہہ کر اپنی خدائی کا سکہ منوایا کہ زندہ رسول سے براہِ راست روحانی تعلق کی بنا پر وہ اس بات کا پورا پورا استحقاق رکھتا ہے کہ جو بات بھی وہ کہے اسے فرمانِ رسول سمجھ کر قبول کیا جائے لیکن اس دوسرے گروہ نے ارشاداتِ رسول کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ارشادات مذہب کا ضروری حصہ نہیں ہیں۔ نبی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اگر کوئی بات کی ہو تو یہ کلام ربانی کی طرح مستقل اور ناقابلِ تغیر نہیں ہو سکتی یہ ایک وقتی اور عارضی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر طرح کے لوگوں کو اس بات کا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق کلام الٰہی کی تعبیر کریں۔ پہلا گروہ رسول کا قائم مقام بنتا تھا۔ لیکن اس گروہ نے رسول کی تعلیمات ہی کو غیر ضروری کہنا شروع کر دیا۔ یہ فتنہ دنیا کے ہر مذہب میں اُٹھا اور اس نے کلامِ الٰہی کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔

اس فتنے کا آغاز ہمیشہ ایک نہایت ہی سادے اور معصوم سے دعوے سے کیا گیا ہے کہ انسان

کی رہنمائی کے لیے بس اللہ کا کلام کافی ہے اور ہر شخص کو اس بات کا پورا پورا اختیار رہے کہ وہ اپنی ضرورت اور عقل کے مطابق اس سے رشد و ہدایت حاصل کرے۔ اس سلسلے میں ذرا مسیحیت کے مشہور مصلح مارٹن لوتھر کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

"یسوع مسیح کا ہر پیرو اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لیے انجیل کی تعبیر خود کرے۔ یہ انجیل کسی ایک مخصوص طبقے کی میراث نہیں۔ اس میں ہدایت کے لیے بڑے واضح احکام موجود ہیں۔ ہر فرد اس کے اصولوں کو خود پرکھ سکتا ہے اور ان کی اہمیت اپنی عقل کے مطابق خود متعین کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی روایت، کسی دستور کسی اخلاقی ضابطے، الغرض کسی خارجی رہنمائی کا محتاج نہیں۔"[۱]

کلامِ الٰہی اور عقل دونوں کو انسانی رہنمائی کے لیے کافی سمجھنے والوں نے بغیر سوچے سمجھے ماضی کی ساری مقدس روایات کو، علومِ دین کے ماہرین کی ٹھوس آرا کو، اور سب سے بڑھ کر ان بزرگ و برتر ہستیوں کی علمی اور عملی توجیہات کو جن پر کلام اللہ نازل ہوا تھا، نظر انداز کر کے کتبِ سماوی کی من مانی تعبیرات شروع کر دیں اور اس طرح مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔

اس بگاڑ میں کوئی چیز بھی غیر متوقع اور انہونی نہ تھی۔ اللہ نے نوعِ بشری کی ہدایت کے لیے صرف چند پند و نصائح کا مجموعہ ہی نہیں بھیجا بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات کا نقشہ دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے سپرد یہ کام کیا ہے کہ وہ اس نقشہ کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کر کے نوعِ انسانی پر اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ اُسے اپنی حیات کو کس نہج پر ڈھالنا ہے۔ تعمیر کا یہ انداز بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ نقشہ، کیونکہ اگر یہ نمونہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو تو پھر اس نقشہ کے عملی مضمرات سامنے نہیں آسکتے۔ اب اگر ایک فرد یا گروہ تعمیر کے اُس مثالی ڈھانچے کو یکسر نظر انداز کر کے صرف نقشے کی مدد سے انفرادی یا اجتماعی زندگی کی تعمیر کا عزم کرتا

[۱] CHARLES BEARD: THE REFORMATION P. 124.

ہے تو وہ اس بات پر مجبور رہے کہ تعمیر کے لیے کچھ دوسرے نمونے سامنے رکھے۔ انسانی ذہن کبھی بھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ اس کے ذہنی پس منظر میں ہر اصول، ہر نظریہ، ضابطہ یا نصب العین کی ایک عملی صورت بھی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نیکی کا تصوّر نیکی کے چند ٹھوس واقعات یا چند نیک انسانوں کی عملی زندگی کو نظروں کے سامنے لائے بغیر کبھی نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح مذہبی احکام اور اُس کی تعلیمات بھی اس بات کی محتاج ہیں کہ اُن کی مکمل مثالی اور صحیح عملی تصویر نہ صرف انسان کے ذہن پر مرتسم ہو بلکہ وہ مستند کتابوں اور مقدس روایات میں بھی محفوظ ہو تاکہ ہر نسل کی تربیت کرتے ہوئے اس تصویر کا نقش اس کے دل و دماغ میں بڑی آسانی کے ساتھ بٹھایا جا سکے۔ اب اگر ایک گروہ اپنی حماقت سے اس تصویر کو مٹا دیتا ہے تو وہ درحقیقت کسی فرد یا قوم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ مذہب کی عملی توجیہ کے لیے کچھ دوسری تصاویر اپنے ذہن میں رکھے۔ یہ تصویریں بالعموم کسی رائج الوقت نظام کے چربے ہی ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مذہب کے اندر جب بھی کسی نبی اور رسول کی فیصلہ کن حیثیت کو ختم کیا گیا تو وہ مذہب اپنا امتیاز کھو کر وقت کے غالب رجحانات کا تابع مہمل بن کر رہ گیا اور وہ فیصلہ کن حیثیت جو کبھی رسول کو حاصل تھی وہ اُن لوگوں کو حاصل ہو گئی جو مذہب کو توڑ مروڑ کر کسی طرح عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے درپے تھے۔ اس طرزِ فکر کے حاملین نے مذہب کو جتنا شدید نقصان پہنچایا وہ کسی دوسرے گروہ کی ریشہ دوانیوں سے کم نہ تھا۔ ان کی کرم فرمائیوں کی وجہ سے مذہب اپنی انفرادیت کھو بیٹھا اور بنی نوع انسان کو رشد و ہدایت کا راستہ دکھانے کے بجائے وقت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ گیا۔ تعلیماتِ ربّانی کی من مانی تاویلات کا کاروبار خواہ کشف یا مشاہدۂ باطنی کی بنیاد پر کیا جائے یا عقل اور عصری تقاضوں کی بنیاد پر، چند اسباب کی وجہ سے فروغ حاصل کرتا رہا ہے۔ انسان کا اس دنیا میں اصل کام خدا کے رسولوں کی ہدایت کے مطابق اُس ذاتِ برحق کی عبادت ہے اور اس کا صحیح مقام اُس ذاتِ بے ہمتا کی بندگی ہے۔ لیکن انسان کے کھلے دشمن شیطان نے اُسے اپنے اصل کام سے ہمیشہ غافل رکھنے اور اُس کے صحیح مقام سے اُسے

محروم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شیطان کے فریب میں آکر مقامِ خداوندی کا دعویٰ کیا اور رب العالمین کی غلامی کا قلادہ گردن میں پہننے کی بجائے لوگوں سے غیر مشروط اطاعت کے طلبگار ہوئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ نظامِ مذہب میں نبی کی مستقل اور فیصلہ کن حیثیت کو زبان سے تسلیم کرنے کے باوجود کمزور کیا جائے اور لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ اُس بزرگ و برتر ہستی کی طرف سے اُن کے پاس کچھ ایسے سربستہ راز نہایت خفیہ طور پر منتقل ہوئے ہیں جن کا انہیں ہی علم ہے اور انہیں جاننے کے لیے صرف انہیں کی طرف رجوع کرنا اور انہیں پر اعتماد کرنا ناگزیر ہے۔ دوسرے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ روحانی ریاضت سے انہوں نے ایک ایسا بلند و بالا مقام حاصل کر لیا ہے جس پر بیٹھ کر وہ نہ صرف اللہ سے براہِ راست ہمکلام ہو سکتے ہیں بلکہ اُس کے رسولوں سے بغیر کسی واسطے کے روحانی تعلق قائم کر کے ہر معاملے کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس بات پر مجبور نہیں کہ کلامِ الٰہی یا انبیاء علیہم السلام کے احکام و فرامین کی پابندی کریں۔ اُن کے مکلّف تو سطحی بیں اور کم علم لوگ ہیں۔ چونکہ اُن کی نگاہیں ظاہری پردوں کو چیر کر اُن عمیق گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہیں جن تک عوام کی رسائی ناممکن ہے، اس لیے وہ اپنے اس خاص اعزاز اور امتیازی مرتبے اور مقام کی وجہ سے اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ دوسروں سے اپنی اندھی تقلید کا مطالبہ کریں۔

دوسری طرف انسانوں کی ایک معتدبہ جماعت نے ان کے اس سراسر ناجائز مطالبہ کو تین وجوہات کی بنا پر قبول کیا۔ ایک تو اس لیے کہ خیالات کے جو گورکھ دھندے انہوں نے تیار رکھے تھے اُن میں "پُر اسرار" کا طالب اپنی تسکین کا وافر سامان فراہم کر سکتا تھا۔ دوسرے اُن کے محیر العقول طرزِ عمل نے انسان کی نظروں کو مفتوح کر لیا۔ اور تیسرے، یہ لوگ مذہب اور روحانیت کے نام پر بعض ایسے عقائد اور اعمال پیش کرتے جن سے مذہب کی پیروی غیر معمولی حد تک آسان ہو جاتی۔ ان کے مسلک کو اپنانے کے بعد انسان اُن ساری اُلجھنوں، دشواریوں

اور مزاحمتوں سے بچ جاتا جو مذہب کو بطور نظامِ حیات قبول کر کے باطل کے خلاف صف آرا ہونے میں پیش آتی ہیں۔ یہاں ساری عمر کشف و کرامات کے سہارے چند دل پسند تورات کو ذہن میں پال کر بڑی آسانی سے گزر جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو مذہب میں رسول کی فیصلہ کُن حیثیت کو مٹا کر اور عقل کو امام بنا کر کلامِ الٰہی کی تعبیر و توجیہ کے لیے آگے بڑھے، انہوں نے بھی یہ سارا کھیل صرف اسی غرض کے لیے کھیلا کہ انہیں انسانی معاشرے میں غیر مشروط اطاعت کا حق حاصل ہو جائے۔ یہ درحقیقت شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ وقت کی اضطراری چال نے معاشرے کے سامنے جو نئے نئے تقاضے پیدا کیے ہیں وہ اُن کا حل مذہب کے نظامِ اجتماعی کو سامنے رکھ کر پیش کرنے سے قاصر ہیں اور اس مقصد کے لیے ان تھک محنت، غیر معمولی غور و تفکر، دین کی گہری بصیرت، اور بے مثال عزم و ہمت درکار ہے تو انہوں نے رسول کی فیصلہ کُن حیثیت کو ختم کر کے مذہب کے پُورے اجتماعی نظام کو ہی درہم برہم کر دیا اور لوگوں کو اس بات کی آزادی دے دی کہ وہ مذہب کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق جس طرح کی تبدیلی چاہیں پیدا کر لیں۔

نبی کی ذاتِ مقدس جو ہر پہلو سے مکمل اور کامل ہوتی ہے اور اس کا دائرہ کار پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ وہ اپنے مشن کا آغاز تطہیرِ افکار سے کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ کا جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کے اندر باطل افکار و نظریات کے کونسے جھاڑ جھنکاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ وہ اوّل انہیں صاف کرنے کی فکر کرتا ہے پھر خداداد بصیرت، دانائی اور تدبّر کے ساتھ ان میں صالح افکار و نظریات اور صحیح عقائد کے بیج بوتا ہے اس فرض کو سرانجام دینے کے بعد وہ اس بنیادی کام سے غافل نہیں ہوتا بلکہ موعظت و حکمت کے ذریعہ اس بیج کی مسلسل آبیاری کرتا رہتا ہے۔ تلقین و ترغیب کے کام میں وہ پیغمبرانہ بصیرت سے کام لیتا ہے کبھی وہ رائج الوقت نظامِ فکر کے اُن گوشوں کا جائزہ لیتا ہے جن میں حق و صداقت کے اجزا غالب ہوتے ہیں پھر خدا پرستی کے ان مانوس اور متعارف تصوّرات کی مدد سے وہ عوام کے دل و دماغ پر باری تعالیٰ کی ذات

اور اُس کی صفات کا صحیح نقش بٹھاتا ہے۔ اور اُن کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں بیدار کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ ایک طرف وہ حق کو اچھی طرح پہچان کر اُسے اپنانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف مروجہ نظامِ فکر میں جو خامیاں موجود ہیں اُن کی نوعیت کو جان کر نہ صرف خود اس سے دستکش ہوں بلکہ بنی نوعِ انسان کو ان باطل اوہام کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کریں۔

پیغمبر کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک ایسا علمِ کلام معرضِ وجود میں آتا ہے جس میں طرزِ استدلال بڑا حکیمانہ، سادہ اور صحیح ہوتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو دینِ حق کا فوراً گرویدہ بنا لیتا ہے جن کی فطرت سلیم ہو یا جنہیں مفادات نے حق کو پہچاننے میں بالکل اندھا نہ کر دیا ہو۔ اسی حقیقت کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اپنے ساتھ جو تعلیمات لیکر آتا ہے اسے لوگوں کے قلب و دماغ میں اتارنے کے لئے ایک نئی حکمت، ایک نیا طرزِ استدلال بھی پیش کرتا ہے جس سے لوگوں کے ذہنوں میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ہم اسے نئی حکمت اور نیا طرزِ استدلال اس وجہ سے نہیں کہتے کہ ان میں کوئی جزو بھی قدیم نہیں ہوتا اور یہاں ہر پہلو نیا ہی ہوتا ہے بلکہ ہم اسے جدید اس لیے کہتے ہیں کہ پورے نظامِ فکر کے اعتبار سے یہ الگ اور جداگانہ ہوتا ہے اگرچہ اس نئے نظام میں پرانے نظام کے صالح اجزا کسی حد تک شامل ضرور ہوتے ہیں۔

نبی دفعتاً خلا میں مبعوث نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک فکری اور نظریاتی ماحول میں رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے اس لیے وہ رائج الوقت نظامِ فکر کے صالح اجزا چھانٹ کر اس مانوس اور متعارف حکمت کے ساتھ عوام کو حق کا فدائی بناتا ہے۔ وہ صرف قدیم نظام کے اچھے اجزا کو باطل اجزا سے الگ کرنے کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ عقل کو اس کے صحیح حدود سے آشنا کرتا ہے اور انسانی زندگی میں اس کے صحیح مرتبہ اور مقام کو متعین کر کے ایک ایسے فطری علمِ کلام کی تدوین کرتا ہے جس سے انسانی ذہن فوراً حق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس کی معرفت حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

آپ قرآن مجید، سنتِ نبوی، بائیبل اور توریت پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کس سادہ طرزِ استدلال کے ساتھ جو انسانی فطرت کے لیے کسی اعتبار سے بھی غیر مانوس نہیں، دینی حقائق کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جاں نثار کسی لمبی چوڑی منطقی بحثوں میں اُلجھے بغیر حق کا پرچار کرتے ہیں اور بڑے سادہ دلائل کے ساتھ بڑے مشکل سے مشکل مسائل سلجھا دیتے ہیں۔ آپ حیات بعد الموت جیسے ادق اور پیچیدہ مسئلے کو لیں اور دیکھیں کہ اسے ذہن نشین کرانے کے لیے روزمرہ زندگی میں سے کتنی عام فہم اور متعارف مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ کبھی انسان کی توجہ نیند اور بیداری کی دو مختلف حالتوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور ان کے ذریعہ زندگی اور موت کی کیفیات کو سمجھایا جاتا ہے۔ کبھی اسے قادرِ مطلق کی بے پناہ قدرت پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اُس کے ذہن کو یہ بدیہی حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ جو خالق اتنی وسیع و عریض کائنات کو تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے اُس کے لیے یہ بات کچھ مشکل نہیں کہ وہ انسان کو زندگی سے محروم کر دینے کے بعد پھر اسے یہ متاع لوٹا دے۔ کبھی قرآن انسان کو زمین کی مختلف حالتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسے یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ جس طرح مردہ زمین خالق و مالک کی رحمت سے زندہ ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح تنِ مُردہ میں بھی اُس کے اشارے سے زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے اور اس میں کوئی چیز بھی خلافِ عقل نہیں۔

آپ قرآن مجید، احادیث نبوی اور دیگر کتبِ سماوی پر جتنا غور کریں گے آپ کو معلوم ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام نے عقائد کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے ایک ایسے طرزِ استدلال سے کام لیا جو سادہ اور حکیمانہ ہونے کی وجہ سے انسانی فطرت اور اُس کے مزاج سے قریب ترین ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی، کوئی الجھن، کوئی مجادلانہ رنگ نہ تھا۔ فطرت کے ٹھوس اور سادہ حقائق کو بالکل فطری انداز میں ذہنوں کے اندر اتارنے کی کوشش کی گئی۔ اس وجہ سے جب بھی انبیاء علیہم السلام دنیا میں کوئی دعوت لیکر آئے تو اس دعوت سے عوام کو روشناس کرانے اور پھر

اس کا انہیں علمبردار بنانے کے لیے انہوں نے تفہیم کے لیے ایک نئے طرزِ استدلال سے کام لیا۔

مگر افسوس یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اُن کے پیروؤں نے اُس سادہ نظامِ فکر اور طرزِ استدلال کو نظر انداز کر دیا جس کی مدد سے اللہ کے یہ پاکباز بندے دینی عقائد کو عوام کے ذہن میں راسخ کرتے تھے۔ آنے والی نسلوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری رجحانات کے مطابق عقائد کی تعبیر و تشریح شروع کی تاکہ انہیں وقت کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے اور یہیں سے عقاید میں بگاڑ شروع ہوا۔ مسیحیت کے نظامِ عقائد میں ہمیں آج جو عجیب و غریب افکار ملتے ہیں وہ سارے دین کے اُن بہی خواہوں کی موشگافیاں اور فلسفہ طرازیاں ہیں جو انہیں یونانی تصورات کے عین مطابق بنانا چاہتے تھے۔ خود مسلمانوں کے ہاں ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود کی جو مختلف بحثیں ملتی ہیں اُن کے چشمے بھی انہیں افکار سے پھوٹتے ہیں۔ جب کوئی قوم کسی وقتی طرزِ فکر کو معیار بنا کر اللہ کے دین کو اُس پر پرکھنے کی کوشش کرتی ہے تو اُس میں دانستہ اور نادانستہ طور پر ایسی تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوتی ہے جن سے دین کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ہم اس مسئلہ پر سرسید کے باب میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے۔ البتہ یہاں ہم مختصراً اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سرسید نے جس عہد میں جنم لیا اُس میں طبیعیات اور اس کے قوانین نے دنیا کی نظروں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ ان قوانین میں ایک قانون، اصول یکسانیتِ فطرت بھی ہے۔ یعنی فطرت کے ضابطے اٹل اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ جو شخص اس اصول پر ایمان رکھتا ہو وہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سرسید اور اس باب میں اُن کے ہمنوا معتقدین، جسٹس امیر علی، مولوی چراغ علی اور مولوی محمد علی لاہوری نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے معجزات کی ایسی تعبیر کرنی شروع کر دی جس سے تعلیماتِ قرآنی اور اصول یکسانیتِ فطرت کا کسی مرحلہ پر بھی تصادم نہ ہونے پائے۔ آپ اگر ان حضرات کی توجیہات پڑھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو اس اصول کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے

لیے ایسی عجیب و غریب تاویلات پیش کی ہیں جن کی کلام الٰہی میں کسی طرح بھی گنجائش نہیں نکلتی اور جو صاف طور پر تحریفات کے ذیل میں آتی ہیں۔

اس گروہ کے برعکس دوسری طرف دین کے بہی خواہوں کا وہ گروہ ہے جس نے عصری افکار و نظریات کو یکسر نظر انداز کر کے دینی عقائد کو عوام کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان حضرات کی مخلصانہ کوشش دین کو انحطاط سے بچانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک انسان کا ذہن جب تک کسی نظریہ سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اُسے پُوری یکسوئی کے ساتھ کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اسی نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرے گا جس کی صحت اور صداقت کا اسے پُورا پُورا یقین ہو اور پھر اس ایقان کی لازوال دولت پا کر ہی وہ اسے ہر دوسرے نظریہ سے سربلند دیکھنے کا نہ صرف آرزومند ہوتا ہے بلکہ اس کے لیے ہر قسم کے ایثار پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔ ایک فرد یا چند افراد کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ عصری افکار و تصوّرات سے یکسر بیگانہ رہ کر زندگی گزار لیں لیکن پُوری قوم کے لیے وقت کے غالب نظریات سے یکسر صرفِ نظر کرنا بالکل ناممکن ہے۔ دین کے جن خادموں نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے دین کو پھیلانے کی کوشش کی، اُن کی نیّت میں خواہ کتنا خلوص اور عزم میں کتنی پختگی تھی لیکن وہ دین کو ایک غالب قوت نہ بنا سکے۔ ان حضرات کی غفلت کی وجہ سے دینِ حق کی حیثیت اس سکے کی بن جاتی ہے جسے اصحابِ کہف کے بیدار ہونے پر اُن کا ایک ساتھی جب سامانِ خورد و نوش خریدنے کے لیے بازار لے کر گیا تو نہ صرف بازار کو بلکہ ملک کو حیرانی میں ڈال دیا کیونکہ وہ ایک ایسا سکّہ تھا جس کا اب بازار میں چلن نہ رہا تھا۔ دین زرِ خالص ہے جسے ہر عہد کے سلیم الفطرت لوگ پُورے جذب و شوق کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کے فکر و نظر کے زاویوں کو درست کیا جاتے تاکہ اس زرِ خالص کو پہچاننے میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

فکر و نگاہ کی درستگی مروجہ افکار و نظریات سے تعرض کیے بغیر تو نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دین کے علمبردار ہر دور کے تصورات کا ناقدانہ جائزہ لیں اور اُس طلسم کو توڑنے کی کوشش کریں جو ان نظریات نے لوگوں کے دل و دماغ پر قائم کیا ہوا ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طلسم اُسی صورت میں ٹوٹے گا جب ان کے ناقدین ان کے اندر جھانک کر اُن خامیوں اور لغزشوں کا کھوج لگائیں گے جو باطل نظامِ حیات میں موجود ہیں۔ اس بنا پر جو حضرات وقت کے غالب رجحانات کا زور توڑے بغیر دین کی سربلندی کا عزم کرتے ہیں وہ اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتے بلکہ ان کی اس کوشش سے بالعموم تین طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۱) یہ حضرات چونکہ دین اور اس کی تعلیمات کے بارے میں نوخیز نسلوں کے ذہنوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اس لیے ان کی زیادہ سے زیادہ اپیل جذبات سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین جو درحقیقت ایک مکمل نظامِ فکر و عمل ہوتا ہے وہ سراسر ایک جذباتی چیز بن کے رہ جاتا ہے۔

دین میں بلاشبہ جذبات کا بھی ایک حصہ ہے اور بغیر جذباتی لگاؤ اور وابستگی کے دین کا مقصد پورا نہیں ہوتا لیکن جب عقل کو خارج کر کے محض جذبات کے سہارے عقائد کے کسی نظام کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا ایک اثر تو یہ ہو گا کہ معتدل اور ٹھنڈے مزاج کے غور و فکر کرنے والے لوگ اُسے قبول کرنے میں متامل ہوں گے۔ ممکن ہے معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے وہ حضرات اپنی دین بیزاری یا دین کے بعض شعبوں کے متعلق اپنے شبہات کا برملا اظہار نہ کریں۔ لیکن وہ دل کی گہرائیوں سے کبھی مطمئن نہ ہوں گے اور محض ظاہرداری کے طور پر دین سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ تو دین کی چھاپ اُن کی زندگی کے کسی گوشہ میں نظر آئے گی اور نہ وہ اپنی اولاد کی اس کے مطابق تربیت کریں گے اور نہ ہی اُس کے علمبردار بن کر اُسے پھیلانے کے لیے فکرمند ہوں گے۔ ایک انسان دل و جان سے

صرف اسی نظریہ کو اپناتا ہے جس پر اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو، اور جب وہ اسے ایک مرتبہ قبول کر لیتا ہے تو اس کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے اور اسے فلاح و کامرانی کا سب سے مؤثر ذریعہ سمجھ کر نہ صرف خود اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کی اس کے مطابق تربیت کرتا ہے بلکہ دوسروں کو اُسے اپنانے کی پوری شدت کے ساتھ تلقین کرتا ہے۔ لیکن جب کسی نظریۂ حیات کے بارے میں کسی شخص کے ذہن میں مختلف شکوک و شبہات ہوں تو وہ نہ خود اُسے پوری یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ قبول کرے گا اور نہ دوسروں کو قبول کرنے کی دعوت دیگا۔ ان حالات میں دین کی حیثیت ایک ایسے نعرے کی سی ہو جائے گی جسے بلند کر کے عوام سے وقتی طور پر داد لی جا سکتی ہو یا اُن کے جذبات سے کھیلا جا سکتا ہو دین کا کھوکھلا نعرہ آخر اسے کتنے دنوں تک زندہ رکھ سکتا ہے۔

(ب) دین کے ساتھ محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے انسان بالکل فطری طور پر اُس کے صرف انہیں حصّوں کو اپناتا ہے جن سے اُس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہو اور باقی شعبوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس سے دین اور دنیا کی تفریق کا غلط تصور معرضِ وجود میں آتا ہے۔ وہ اپنے دنیاوی معاملات کو دین کی بنیادوں پر اُستوار کرنے کے بجائے وقت کے فکری رجحانات پر اُستوار کرتا ہے اور دین کو صرف محراب و منبر اور گیان دھیان تک محدود کر دیتا ہے۔ دین کے اندر وجد و حال کی کیفیات اسی جذباتیت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

(ج) اس طرزِ فکر کا نتیجہ انسانی طبائع پر بھی مترتب ہوتا ہے۔ انسان پُورے دین اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک متوازن نگاہ ڈالنے کے بجائے صرف اُس کے چند دلپسند گوشوں سے غیر معمولی دلچسپی پیدا کر لیتا ہے اور پُورے دین کو ان میں سمٹا ہوا سمجھ کر اُن کے بارے میں غیر معمولی حسّاس ہو جاتا ہے جس سے اس کے فکری توازن میں بالکل قدرتی طور پر اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسی بیکار بحثوں میں اُلجھا لیتا ہے جو دین کے اندر یا تو سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں یا بہت کم اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مسالک کے درمیان

عرصۂ دراز سے جو سر پھٹول ہو رہی ہے اس کے اسباب پر اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑی معمولی معمولی چیزیں نزاع کا موجب بنی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان بنیاد اور اصول کے اختلاف کی بہ نسبت جذبات کا اختلاف کہیں زیادہ ہے۔ دنیا کا ہر مذہب بنیادی عقائد اور اصول و فروع کا ایک جاندار مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر جب جذبات کی شدت فکر و نگاہ کے زاویوں کو متزلزل کر دیتی ہے تو پھر فروعات اصولوں کی جگہ لے لیتی ہیں اور انسانوں کی توجہ کا مرکز و محور بن جاتی ہیں۔ چونکہ انسان ان کے ساتھ بالکل جذباتی وابستگی رکھتا ہے اس بنا پر وہ ان کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس ہوتا ہے اور ان کے متعلق کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتا جس سے اس کے جذبات کو ذرہ برابر بھی ٹھیس پہنچے۔ آج ہمارے ہاں جو مذہبی بحثیں ہوتی ہیں ذرا ان کے موضوعات اور ان پر اظہارِ خیال کے انداز کا جائزہ لیں تو آپ کو خود یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ آج مسلمان قوم نے کن چیزوں کو اپنا دین بنا رکھا ہے اور اپنی صلاحیتیں اور قوتیں کن کاموں میں کھپا رہی ہے۔

جب مذہبی ماحول میں جذباتیت غالب ہو تو اندازِ تبلیغ میں بھی حکمت اور تدبر کا جوہر مفقود ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دین کے علمبرداروں کی نگاہیں اُن فکری اور عملی کوتاہیوں سے ہٹ جاتی ہیں جن میں امت مبتلا ہوتی ہے اور ان کی ساری توجہ اُن مسائل پر صرف ہونے لگتی ہے جن میں اختلاف کے زیادہ سے زیادہ پہلو نمایاں کیے جا سکیں۔ پھر کسی بات کو حکمت اور دلسوزی کے ساتھ ذہن نشین کرانے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ کفر کے فتووں اور عذابِ الٰہی سے ڈرا دھمکا کر سیدھے سادھے عوام کو خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان حالات میں تکفیر کا ایسا طوفان اُٹھتا ہے جس سے عوام مذہب اور ان کے علمبرداروں سے یکسر متنفر ہو جاتے ہیں اور مذہب تنگ نظری، تعصب، رجعت پسندی اور بیوقوفی کا مترادف بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کے اندر ایک عام مذہبی بیزاری پھیلنے لگتی ہے اور وہ ہر اُس چیز سے نفرت کرنے لگتے ہیں جس کا مذہب سے کوئی دُور کا بھی تعلق ہو۔ مذہبی طبقوں کا معاشرے میں احترام

ختم ہو جاتا ہے۔ وہ طنز وتضحیک کا ہدف بن جاتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ یہ گروہ کسی افادیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کا کام سراسر منفی نوعیت کا ہے جس میں سرِفہرست اللہ کے نام پر لوگوں میں فساد پھیلانا ہے۔

عقائد سے گزر کر جب ہم اعمال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں بگاڑ کے قریب قریب یہی اسباب ملتے ہیں۔

جب کوئی نبی دنیا میں مبعوث کیا جاتا ہے تو وہ عقائد وافکار کی طرح اعمال وافعال کا بھی ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک نیا طرزِ معاشرت، ایک نیا نظامِ معیشت، ایک نئی سیاسی ہیئت، ایک نیا نظامِ قانون، الغرض ایک نئی تہذیب معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس تہذیب کے سارے اجزا بالکل نئے ہوں۔ اس میں رائج الوقت تہذیب کے صالح عناصر بھی شامل ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان عناصر کو چھانٹ کر نئی تہذیب کی تعمیر میں ان سے کام لینے کی نازک ذمہ داری خود نبی پر عائد ہوتی ہے اس لیے اس میں قطعاً کوئی خامی باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا رسول اپنے خالق ومالک کی رہنمائی میں رائج الوقت اجتماعی نظام کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے پھر باری تعالیٰ کی عطاکردہ بصیرت کے مطابق اُن کے اچھے اجزا کو الگ کرتا ہے اور ان میں ضروری ردّوبدل کرکے انہیں دینی مزاج کے مطابق ڈھالتا ہے اور نئے نظامِ حیات کی تشکیل میں اُن سے جس قدر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو اٹھاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کچھ مدت تک تو دینی نظام پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس میں اتنی غیرمعمولی قوت وتوانائی ہوتی ہے کہ جن دوسری تہذیبوں سے اس کا سامنا ہوتا ہے ان کے صالح اجزا کو جو اس کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں خودبخود جذب کرلیتا ہے اور انہیں اس طریق سے اپناتا ہے کہ وہ اسی کا ضروری حصہ بن کر رہ جاتے ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اجزا اسی دینی نظام کو

قوت و توانائی بہم پہنچانے کے لیے معرضِ وجود میں آتے تھے۔ اس طرح دینی تہذیب مسلسل ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کا دائرہ برابر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

مگر عقائد کی طرح یہ صورتِ حال بھی عرصہ دراز تک قائم نہ رہ سکی۔ غیر دینی افکار و رجحانات اور خدا سے باغی قوموں کے افعال و اعمال نے دین کے لائے ہوئے نظامِ عمل میں سرایت شروع کی۔ آغاز میں سرایت کی رفتار بڑی سست اور اس کا عمل بڑا غیر محسوس تھا۔ پھر اسے روکنے کے لیے بڑے بڑے آئمہ، صلحاء اور فقہاء موجود تھے جو دین کا پورا فہم اور اس کے مزاج سے پوری مناسبت رکھنے کی وجہ سے ہر نئی چیز کو چھان پھٹک کر دیکھتے تھے اور عوام کو دو ٹوک انداز میں بتا دیتے تھے کہ آیا فلاں چیز قابلِ قبول ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حد تک ہے۔ لیکن دین سے عوام کی وابستگی جتنی کم ہوتی چلی گئی ہے اسی نسبت سے اُن کا دینی شعور ماند پڑتا گیا اور باطل نظامہائے حیات کی بہت سی اقدار دینی نظام میں گھس آئیں۔ ان حالات میں نہ تو دین کے اندر اتنی قوت باقی رہی کہ وہ انہیں نکال پھینکے اور نہ علماء کے اندر اتنی دینی بصیرت، اور دین کی حفاظت کا اتنا جوش اور ولولہ باقی رہا کہ وہ نئی اقدار کے بارے میں وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر دینی مزاج اور اس کے مطالبات کے پیشِ نظر صحیح صحیح فیصلہ کر سکیں اور پھر اپنے اس فیصلے کو اپنی خدا ترسی، بے نفسی، دین کے اندر گہری بصیرت اور اس کے ساتھ غیر معمولی محبت کی بنا پر عوام سے منوا بھی سکیں۔

دین کا زیادہ تعلق چونکہ انسان کے باطن سے ہے اس لیے وہ فطری طور پر انہیں باتوں کو خوشدلی کے ساتھ آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے جن کے متعلق اُس کا ضمیر مطمئن ہو کہ یہی منشاء خداوندی ہے۔ اس بنا پر فقہی استنباط کی نوعیت عدالتی فیصلوں سے مختلف ہوتی ہے۔ عدالتوں کی طرف انسان دنیا کی سرخروئی کے لیے رجوع کرتا ہے لیکن فقہاء اور ائمہ کی خدمت میں وہ اس لیے حاضر ہوتا ہے کہ جن احکام کے بارے میں اُس کے خالق اور مالک نے کوئی تصریح نہیں کی اور جن کی وضاحت میں اللہ کے رسول نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا اُن کے متعلق

دینی احکام حاصل کیے جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس نازک کام کے لیے عوام ہر شخص پر تو اعتماد نہیں کر سکتے۔ وہ اس معاملے میں صرف انہیں حضرات کی تصریحات اور فیصلوں پر اعتماد کر سکتے ہیں جن کے زہد و تقویٰ، جن کی للّٰہیت، جن کی علمی استعداد، حالات کے صحیح فہم و ادراک اور پھر دینی تعلیمات کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت پر انہیں پورا پورا بھروسہ ہو۔ یہ چیز مذہب کے مزاج کے خلاف ہے کہ رسول کی نیابت کا حق اُن لوگوں کو سونپ دیا جائے جو غیر دینی افکار و نظریات سے مرعوب ہو کر دین کے اندر ایسی تراش خراش شروع کر دیں جس سے اُس کا حُلیہ ہی بگڑ کر رہ جائے۔

جب دنیا کے اندر بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوتا ہے تو عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخر ہم کیوں لکیر کے فقیر بن کر فقہا کے فیصلوں کو بلاچون و چرا قبول کرتے رہیں۔ اگر ان حضرات کو سوچنے کا حق تھا تو ہم بھی یہ حق رکھتے ہیں اور اس سے کسی طرح بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ اگر آئمہ سلف نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر احکام خداوندی سے استنباط کیا تو ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ یہ بات بظاہر بالکل ٹھیک اور درست ہے کہ فقہاء انسان تھے اور اُن سے غلطی کے سرزد ہونے کے امکانات موجود تھے۔ لیکن دورِ انحطاط میں "اجتہاد" کے معنی اور مدعا دونوں بدل جاتے ہیں اور جو لوگ اس طرح کا نعرہ بلند کرتے ہیں اُن کے سامنے دین کو سربلند کرنے کے بجائے کچھ دوسرے مقاصد ہوتے ہیں۔ ان کی غرض اللہ کے منشا کو سمجھنا نہیں ہوتی بلکہ غور و فکر کے حق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دین کے اندر نئے نئے فتنے اٹھانا ہوتی ہے۔ اس طبقے سے بھی دین کو بے حد نقصان پہنچتا ہے اور ان کے تجدد پسندانہ رجحانات سے دینی نظام کے اندر بعض ایسی چیزیں داخل ہو جاتی ہیں جن سے اُس میں زبردست اختلال رُونما ہوتا ہے۔

پھر ان حضرات کی مذموم کوششوں کا ایک خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ ان لوگوں کی خرافات کو امت کا اجتماعی ضمیر دینی احکام کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اس لیے یہ لوگ بگڑے ہوئے حکمرانوں کے ساتھ ساز باز کرکے اپنے ان گمراہ کن خیالات کو قوت کے ذریعے عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں زبردستی ان کا قائل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سازش کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں کبھی تو بگڑے ہوئے اصحاب اقتدار اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے ان علمائے سُو کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں اور کبھی یہ بگڑے ہوئے مفتی اپنے گمراہ کن خیالات کی ترویج کے لیے بڑی عیاری کے ساتھ حکمرانوں کو استعمال کرتے ہیں۔

مذہب میں جہاں نری جذباتیت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ وہاں مجرّد عقل کی پیروی سے بھی اس میں کئی پہلوؤں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اگر مذہب کی صداقت کے لیے عقل کی گواہی کو ضروری قرار دیا جائے تو اس سے مذہب کے اصول ومبادی کی تو کسی حد تک تائید ہوتی ہے لیکن اس کے ہر ہر جزو کے لیے عقلی دلائل فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ مذہب کے اندر بہت سے ایسے مافوق الطبیعی مسائل بھی آتے ہیں جن کی صداقت کی بہار او جا ان گواہی دیتا ہے لیکن جن کے بارے میں عقل کوئی حتمی اور قطعی ثبوت فراہم نہیں کر سکتی۔ عقل کی بہرحال اپنی ایک حد ہے جس سے آگے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مجرّد عقل کی پیروی کرنے میں دوسری دقت یہ پیش آتی ہے کہ عقل کا خود کوئی اپنا بندھا ٹکا معیار نہیں جس کے مطابق ہر دور میں کسی عقیدہ کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگایا جا سکے۔ آپ دیکھیے کہ آج ہم اس چیز کو عقل کے مطابق مانتے ہیں جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہے لیکن یونانی فلسفہ میں بہت سے ایسے عقائد اور نظریات عقل کی رُو سے صحیح اور برحق تسلیم کیے جاتے تھے جن کا تجربہ اور مشاہدہ سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ معجزات آج کے انسان کی نظر میں عقلی اعتبار سے اَن ہونی باتیں ہیں لیکن آج سے چھ سات سو سال قبل کے انسان کے لیے معجزات کا انکار سراسر ایک غیر عقلی اور غیر فطری بات تصور کی جاتی تھی۔ مذہب کے بارے میں ہر دور میں جو نت نئی بحثیں چھڑتی ہیں اور نئے نئے شکوک وشبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہر دور اپنے ساتھ عقل کے نئے نئے تصورات لاتا ہے۔

اب اگر صرف عقل کو معیارِ حق و باطل بنا کر دینی عقائد کی صداقت کا فیصلہ کیا جائے تو مذہب میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونگی۔ ان حالات میں ہر دور کے "نام نہاد مفکرین مذہبی عقائد اور اُس کے نظامِ عبادات میں ایسے تغیرات اور ایسی تحریفات کرنے پر مجبور رہینگے جو اُس دور کے عقلی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

مذہب کے بارے میں اس خالص عقل پرستانہ طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں سے وجدان اور جذبات کے سارے بیش قیمت عناصر کو خارج کرنا پڑا اور مذہب چند فلسفیانہ نظریات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ مذہب میں بلاشبہ عقل کا ایک حصہ ہے اور دینی مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں عقل سے مفید کام لیا جا سکتا ہے لیکن دین جتنا ایک مربوط نظامِ فکر و عمل ہے اس سے کہیں زیادہ انسان کے قلبی اور روحانی احساسات و جذبات کی تسکین کا ذریعہ بھی ہے مذہب کی پیروی میں انسان ایک قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی پریشانیوں اور اُس کے مصائب سے گھبرا کر وہ اکثر اوقات اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں پناہ لیتا ہے جس طرح بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈر کر بھاگتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُسے اس خوف کی نفسیاتی وجہ سمجھائے بلکہ وہ ماں کی اُس محبت بھری گود کو تلاش کرتا ہے جو اُس کے اضطراب کو دور کرے اور اُس کے خوف کو اطمینان اور سکون میں تبدیل کر دے۔ بالکل اسی طرح انسان کے لیے مذہب آغوشِ مادر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں پناہ لیکر وہ اپنی بے چین روح کو تسکین اور آرام پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ خدا کو ایک اکائی یا ایک اصول نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی زندہ اور شفیق ہستی خیال کرتا ہے جو اُس کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرکے اُسے ہر وقت اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کے لیے تیار رہتی ہے، جو اُس کی نظر میں ماں سے زیادہ رحم دل اور باپ سے زیادہ کریم ہے۔ مذہب نے انسان کو ہمیشہ اپنی ذاتی پریشانیوں کو دور کرنے اور آلام و مصائب کو صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ مذہب انسان کا ایک زبردست سہارا ہے جو اُس کی مایوسیوں اور محرومیوں کو امیدوں سے بدل

دیتا ہے۔ ایک فرد پر جب ہر طرف سے عرصۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے جب اُس کے اعزہ اقارب اُس کی سیاہ بختیوں کی وجہ سے اُس سے مُنہ موڑ لیتے ہیں، جب انسان اوروں کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بوجھ بن جاتا ہے، اُس وقت اگر انسان کو کوئی ذات سکون بخشتی ہے، اُسے صعوبتوں پر عبور پاتے اور عارفانہ تیور اور بے نیازانہ وضع کے ساتھ سب کچھ برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے تو وہ رب العالمین کی ذات ہی ہوتی ہے جس سے قلبی تعلق پیدا کر کے انسان اپنے اضطراب کو سکون میں بدل لیتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہب ہمیشہ دکھے ہوئے دلوں کے لیے مرہم اور مصائب سے نڈھال انسان کے لیے ایک بڑے سہارے کا کام دیتا رہا ہے۔

مذہب کی خالص عقلی تعبیر میں اُس کی یہ مربیانہ اور ہمدردانہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ علت و معلول کا ایک بے حس نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے مذہب کی عمارت کو خالص عقلی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی انہوں نے اس میں سے انسانیت کے لطیف عناصر مثلاً سوز و گداز، ایمان و ایقان اور عشق و محبت کو خارج کر دیا۔ خالص عقل نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ علت و معلول کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جس میں دکھے ہوئے دلوں کا کوئی مداوا نہیں، جس میں روح کی تسکین کے لیے کوئی سامان نہیں جس میں خدا کے ساتھ کسی ذاتی تعلق کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان حضرات کے نزدیک باری تعالیٰ محض ایک عدد بالکل لگے بندھے قوانین اور اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اس بنا پر اُس کے حضور میں تضرع و زاری یا اُس کی خصوصی رحمتوں کے لیے اُس کی بارگاہ میں التجا محض بیکار چیزیں ہیں۔ وہ ذات بے ہمتا انسان کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہیں رکھتی۔ فطرت کے بے حس ضابطوں کی پابندی سے ہی اُس کا منشا پُورا کیا جا سکتا ہے۔ آپ مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ جب بھی مذہب کو عقل کا تابع بنایا گیا تو اس کے بعد اس کی جو صورت سامنے آتی اُس میں خدا سے محبت کی بہ نسبت قوانینِ فطرت کی پیروی پر زیادہ زور تھا۔ اور انسانی روح کی

تسکین و تشفی کے لیے کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ مذہب نے انسان کو علت و معلول کے رشتوں سے بیگانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ان رشتوں کی اہمیت کا پورا پورا احساس دلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کے ذہن میں یہ خیال بھی راسخ کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک ان رشتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا نہیں۔ وہ جب چاہتا ہے ان متعارف اور محسوس رشتوں کے واسطوں سے نہیں بلکہ ان سے الگ ہو کر بھی اپنے بندوں کی دستگیری کرتا ہے اور جب بھی وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ انہیں آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیتا ہے کیونکہ وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا اور تمام درگزر کرنے والوں سے بڑا درگزر کرنے والا ہے۔ اگر مذہب ان لطیف احساسات اور تصورات سے محروم ہو جائے تو پھر وہ مذہب نہیں بلکہ طبیعیات، معاشیات اور عمرانیات کا علم بن کر رہ جاتا ہے جو شاید انسان کی خارجی زندگی کو سنوارنے میں تو کسی حد تک مفید ہوں لیکن اس کے قلبی اور روحانی اضطراب کو دور کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

رسائل و مسائل

تفسیر قرآن کے متعلق دو سوالات

سوال۔ تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے دو مقامات کے بارے میں قدرے تردد پیدا ہوا ہے۔ اگر آپ میرے شکوک کو رفع فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

(ا) قرآن کریم کی ظاہری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمان چند مخصوص مواضع کا نام ہے جو اس زمین سے علیحدہ مکانات ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر چھت کی طرح ہیں مثلاً سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا۔ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے باقاعدہ دروازے ہونگے مثلاً وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا۔ احادیث میں اس کی تشریح حدیث معراج میں ملتی ہے جس میں صریح طور پر سات آسمانوں کو سات علیحدہ علیحدہ مکانات تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر آپ نے تفہیم القرآن جلد ۱ سورہ بقرہ حاشیہ ۳۴ کے تحت لکھا ہے کہ "بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔"

ازراہِ کرم اس عبارت کی ان نصوص کی روشنی میں تشریح کریں تاکہ آپ کا بیان کردہ نظریہ پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

(ب) تفہیم القرآن جلد ۱ سورۂ نساء حاشیہ نمبر ۱ کے تحت آپ نے لکھا ہے کہ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کے بارے میں عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائیبل

میں بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے"۔ اس کے بارے میں عرض ہے کہ یہ حدیث جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے یہ تو بخاری اور مسلم کی ہے۔

ازراہِ کرم اس بارے میں تحریر فرمائیں کہ کیا یہ حدیث ناقابلِ قبول ہے اور اگر نہیں تو اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

جواب۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) جو اشیاء کبھی انسان کے علم اور تجربے میں نہیں آئی ہیں ان کے لیے انسانی زبان میں الفاظ نہیں پائے جاتے۔ ایسی چیزوں کا جب قرآن و حدیث میں ذکر کیا جاتا ہے تو انسانی زبان کے وہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو انسان نے اپنے دائرۂ محسوسات میں پائی جانے والی اشیاء کے لیے وضع کیے ہیں۔ ان الفاظ کو بالکل ان کے لغوی معنی میں لے لینا درست نہیں ہے، بلکہ ان کی مدد سے غیر محسوس اشیاء کے متعلق صرف ایک اجمالی تصور ذہن میں قائم کرنا چاہیے۔ تاہم اگر کوئی شخص چھت کا لفظ سن کر اپنے گھر کی چھت ہی کا خیال کر سکتا ہو، اور دروازے کے لفظ سے اس کے ذہن میں صرف وہی تصویر آ سکتی ہو جو اپنے گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں سے اس کے مشاہدے میں آ رہی ہے تو وہ بیچارہ معذور ہے، اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جس طرح بات کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہے اس سے زیادہ وسیع مفہوم میں اسے سمجھے۔

(۲) حضرت حوا کے پسلی سے پیدا کیے جانے کا عقیدہ جن احادیث پر مبنی قرار دیا جاتا ہے ان میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں، بلکہ ان میں سے ایک کے الفاظ یہ ہیں کہ عورتیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں (استوصوا بالنساء خیراً فانھن خُلقن من ضلع)، عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے (المرأۃ کالضلع)، اور تیسری میں فرمایا گیا ہے کہ عورت ذات پسلی سے پیدا ہوئی ہے (المرأۃ خلقت من ضلع

مزید براں ان سب حدیثوں میں اصل موضوعِ بحث انسانی تخلیق کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ حضورؐ نے یہ بات اس غرض کے لیے بیان فرمائی ہے کہ عورت کے مزاج میں پسلی کی سی کجی ہے۔ اس کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی اسی فطری کجی کو ملحوظ رکھ کر ہی اس سے برتاؤ کرنا چاہیے۔ کیا واقعی آپ کا خیال یہ ہے کہ ان احادیث کی رُو سے حضرت حوا کا آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا ایک اسلامی عقیدہ قرار پاتا ہے؟ (ا۔م)

ذکرِ الٰہی اور اُس کے طریقے

سوال۔ ذکرِ الٰہی کے مسنون یا غیر مسنون ہونے کے معاملے میں مجھے بعض ذہنی اشکالات پیش آ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا ایک اثر بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ وہ ذکر کے لیے ایک مقررہ جگہ پر جمع ہوا کرتے ہیں تو غصے میں فرمایا کہ کیا تم اصحابِ رسول اللہؐ سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں تو مَیں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا، پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو؟

دوسری طرف مشکوٰۃ میں متعدد احادیث ایسی موجود ہیں جن سے اجتماعی ذکر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انس راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغوں سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت ابوسعید سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بیٹھتی کوئی قوم ذکرِ الٰہی کے لیے مگر یہ کہ گھیر لیتے ہیں اسے فرشتے اور چھا جاتی ہے اس پر رحمت۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ فرشتے ذکرِ الٰہی کی مجالس کو ڈھونڈتے ہیں اور ان میں بیٹھتے ہیں۔

ان احادیث کی روشنی میں حلقۂ ذکر کا بدعت ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ

واضح کریں کہ ارشاداتِ نبوی کی موجودگی میں حضرت ابن مسعودؓ کے قول کی کیا صحیح توجیہ ہو سکتی ہے ؟

جواب : لفظ ذکر کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے ۔ اس کے ایک معنی دل میں اللہ کو یاد کرنے یا یاد رکھنے کے ہیں ۔ دوسرے معنی اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں طرح طرح سے اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں ، مثلاً موقع بموقع الحمدللہ ، ماشاء اللہ ، انشاء اللہ ، سبحان اللہ وغیرہ کہنا ، بات بات میں کسی نہ کسی طریقے سے اللہ کا نام لینا ، رات دن کے مختلف احوال میں اللہ سے دعا مانگنا ، اور اپنی گفتگوؤں میں اللہ کی نعمتوں اور حکمتوں اور اس کی صفات اور اس کے احکام وغیرہ کا ذکر کرنا ۔ تیسرے معنی قرآن مجید اور شریعت الہیہ کی تعلیمات بیان کرنے کے ہیں ، خواہ وہ درس کی شکل میں ہوں ، یا باہم مذاکرہ کی شکل میں ، یا وعظ و تقریر کی شکل میں ۔ چوتھے معنی تسبیح و تہلیل و تکبیر کے ہیں ۔ جن احادیث میں ذکرِ الٰہی کے حلقوں اور مجلسوں پر حضورؐ کے اظہارِ تحسین کا ذکر آیا ہے اُن سے مراد تیسری قسم کے حلقے ہیں ۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جس چیز پر اظہارِ ناراضی کیا ہے اس سے مراد چوتھی قسم کا حلقہ ہے ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حلقے بنا کر تسبیح و تہلیل کا ذکرِ جہری کرنا رائج نہ تھا ۔ نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی اور نہ صحابہ نے یہ طریقہ کبھی اختیار کیا ۔ رہا پہلے دو معنوں میں ذکرِ الٰہی ، تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے حلقے بنا کر ہو ہی نہیں سکتا ، بلکہ وہ لازماً انفرادی ذکر ہی ہو سکتا ہے ۔ (ا ۔ م)

وَالنَّجْم کی ابتدائی آیات کی تاویل

سوال : قرآن کی سورۂ نجم کی آیت ثم دنٰی فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی میں بالعموم دنٰی فتدلّٰی کا فاعل جبریل قرار دیا جاتا ہے حالانکہ صحیح بخاری شریف کی حدیث معراج میں ہے :

حتی جاء سدرۃ المنتہیٰ دنا الجبار رب العزۃ فتدلّیٰ حتی کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ (یہاں تک کہ حضور علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو رب العزۃ جل جلالہ حضور علیہ السلام کے قریب ہوتے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور زیادہ قرب حاصل کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام سے دو کمانوں کی مقدار یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا)۔

اس کی شرح میں علامہ عینی اور علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا جمال مبارک سر اقدس کی آنکھوں سے دیکھا۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رأیت ربی عزوجل فی احسن صورۃ (میں نے اپنے رب کو بہت اچھی صورت میں دیکھا) اور پھر کان قاب قوسین او ادنیٰ کے آگے ہے فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ' جو صریح دلیل ہے اس بات کی کہ فکان قاب قوسین میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے، ورنہ حضور علیہ السلام جبریل کے بندے قرار پاتے ہیں (معاذ اللہ)

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بخاری کی اس صحیح اور واضح حدیث کے بعد اس آیت کی دوسری تاویل کیسے درست ہو سکتی ہے جس میں جبریل کا دیکھا جانا اور قریب ہونا مراد لیا جاتا ہے اور اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی یعنی ذاتِ الٰہی کو دیکھا ہے اور بالکل قریب ہو کر دیکھا ہے؟

جواب: سورۃ والنجم بالخصوص اس کا پہلا رکوع قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ایک ہے۔ اس میں بیشتر آیات ایسی ہیں جو متشابہات کی قبیل سے ہیں اور جن کی صحیح تاویل اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم علمائے راسخین نے اپنے اپنے فہم اور بصیرت کی حد تک ان کے مطالب بیان کیے ہیں۔

اس سورۃ کے بارے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول کیا ہے اور عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی، نیز آیات مابعد میں جو عظیم الشان واقعہ یا سلسلۂ واقعات بیان ہوا ہے

وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ کس دَور میں پیش آیا ہے؟ سورۂ نجم کو بالعموم مکّی عہد کی ابتدائی نازل شدہ سورتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے بخاری اور دیگر صحاح میں ایسی احادیث مروی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی وہ پہلی سورت ہے جس کی آخری آیت کے ذریعہ سے سجدۂ تلاوت کا آغاز ہوا ہے۔ اب اگر پوری سورت مکّی دَور کے ابتداء میں نازل ہوئی ہے تو اس کا پہلا رکوع اس واقعۂ معراج سے کیسے متعلق ہو سکتا ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہے؟ مستند ترین احادیث کی رُو سے یہ معراج ہجرت سے صرف ایک یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی ہے۔

اس اشکال کو مختلف پیرایوں میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اسراء کا واقعہ متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔ بعض نے فرمایا ہے کہ سورۃ کا ابتدائی حصّہ مکّی عہد کے اوائل میں نازل ہُوا ہے اور بعد کا حصّہ اواخر میں، یا دوسرے لفظوں میں وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی میں جس واقعے کا ذکر ہے وہ معراج سے پہلے کا ہے اور وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی اور اس سے آگے جو کچھ بیان ہُوا ہے وہ لیلۃ الاسراء میں پیش آیا ہے۔ اس ضمن میں بعض روایات سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی حراء یا ابطح یا دوسرے کسی مقام پر وہ کیفیت پیش آئی تھی جو دنیٰ فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں مذکور ہے۔ مگر ان جملہ اقوال و تاویلات کے باوجود وہ پیچیدگی پُورے طور پر رفع نہیں ہوتی جو معراج کے مشہور واقعہ پر سورۂ والنجم کے کسی حصے کو بھی چسپاں کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ محتاط اور صائب موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے کسی جزء کا تعلق معراج کے ساتھ نہ جوڑا جائے اور اس کے پہلے رکوع میں جو کچھ بیان ہوا ہے اُسے اس سلسلۂ تربیت و تعلیم کی اہم کڑیوں میں شمار کیا جائے، جس میں سے آنحضورؐ کو آغازِ نبوت میں گزارا گیا تھا۔ اس تادیب و تربیت کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے اندر وحی کے اخذ و تحمّل کی قوت پیدا ہو جائے اور ملاءِ اعلیٰ اور جبریلِ امین سے آپ کی موانست و مناسبت قائم ہو

جائے۔ قرآن و حدیث میں اس سلسلے کے دیگر متعدد واقعات مذکور ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔
تاہم شانِ نزول کی بحث سے قطع نظر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس سورۃ کا تعلق واقعۂ معراج سے ہے، تب بھی دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس کی ابتدائی آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ معلّم کون تھا، اُفقِ اعلیٰ پر کون تھا، کون کس سے قریب ہوا، کون جھکا، کس نے وحی کی ۔۔۔۔۔۔ اور کس نے کس کو دوبارہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس نزول کرتے دیکھا؟ سلف میں سے بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ ذاتِ باری اور ذاتِ نبوی کے مابین پیش آیا ہے۔ ان کے نزدیک الافق الاعلیٰ پر اللہ خود مستوی ہوا، اللہ اپنے نبی سے قریب ہو گیا یا نبی اللہ سے قریب ہو گیا اور قرب سے مراد قرب مکانی نہیں بلکہ قربتِ معنوی ہے۔ ان حضرات کی تاویل کے مطابق مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۔۔۔۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں جس رویت کا ذکر ہے اس سے مراد آنحضورؐ کا رویتِ باری سے مشرف ہونا ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ رویت مادی آنکھوں سے ہے یا فقط قلب و فؤاد کی رؤیت ہے، نیز یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ یہ دیدار عین ذاتِ الٰہی کا ہے یا انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کا ہے۔
اس قول کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بخاری شریف کی بھی حدیث مذکور ہے۔ لیکن اس حدیث سے استدلال اشکالات سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلے میں سورۃ والنجم کی متعلقہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اس حدیث پر انحصار کرنا قرینِ صحت نہیں ہے۔
سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت جس میں دنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتّٰی کان منہ قاب قوسین ۔۔۔ کے الفاظ مروی ہیں اور جسے امام بخاری کتاب التوحید، باب کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً میں مفصل لاتے ہیں، اس کا سلسلۂ اسناد حضرت انس پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے ابواب میں معراج کے متعلق مرفوع احادیث موجود ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انسؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ نے روایت کی ہیں، مگر ان میں سورۃ النجم کے یہ الفاظ اس تشریح کے ساتھ وارد نہیں ہیں اور یہ روایت کئی پہلوؤں سے ان احادیثِ مرفوعہ سے متعارض ہے۔

دوسری قابل ذکر بات اس روایت کے بارے میں یہ ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن پر محدثین نے روایت و درایت کے اعتبار سے متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ اس کے اسناد میں ایک راوی شریک بن عبداللہ ہیں جن پر بعض محدثین نے شدید جرح کی ہے اور وہ جرح شروح بخاری میں منقول ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے (کتاب الایمان، باب المعراج) میں شریک کی اس روایت کی سند بیان کرنے کے بعد اس کے متن کا صرف ایک ابتدائی فقرہ بیان کرکے چھوڑ دیا ہے اور پھر اس راوی کے متعلق تنبیہ و تنقید کے ان الفاظ کو اپنی جانب سے ثبت کرنا ضروری سمجھا ہے: قدّم فیه شیئًا واخّر وزاد ونقص (راوی نے اس روایت میں متن کے کچھ الفاظ کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور بڑھا گھٹا دیا ہے)۔ بخاری اور مسلم دونوں کی کتاب التفسیر اس روایت سے خالی ہے۔

اس حدیث کے متن اور مضمون پر درایۃً بھی بعض معارضات عائد کیے گئے ہیں۔ امام خطابی نے اس پر جن الفاظ میں تنقید کی ہے، اسے فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی ... کی تاویل میں ممکن اشکالات اور ان کے جوابات کو امام خطابی کی زبانی علامہ ابن حجرؒ نے مفصل بیان کیا ہے۔ امام خطّابی نے اور خود ابنِ حجر نے اعتراضات یوں دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک رؤیا تھا جس میں دنو، تدلّی اور نزول کی کیفیات، اللہ تعالیٰ کے باب میں مستبعد اور موجبِ قباحت نہیں، لیکن دنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی کے الفاظ کی روشنی میں ساری آیات کی ایک ایسی تعبیر اور ذات باری سے متعلق ایسی تشبیہ و تصویر لازم آتی ہے جس کا وقوع عالم لامکان اور حالتِ رویاء میں بھی اشکال و اعتراض سے بالکل بری نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریک کی اس روایت میں اور بھی بہت سے پہلو محلِ نظر ہیں، جن کا یہاں بیان کرنا غیر ضروری اور باعثِ طوالت ہے۔ خود حافظ ابنِ حجر نے گیارہ یا اس سے زاید اعتراضات گنوائے ہیں اور ان کے دفعیے کی پوری سعی کی ہے، لیکن بعض جوابات پوری طرح

تشفی بخش نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس روایت کا آغاز یوں ہے : لیلۃ اُسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ انہ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحیٰ الیہ۔ گویا کہ یہاں آنحضورؐ کے جس اسراء کا ذکر ہے وہ ابتدائے وحی سے پہلے کا واقعہ ہے، اور متصلاً آگے جو عبارت متن میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسجد حرام میں خوابیدہ تھے کہ تین فرشتے آئے اور ایک نے کہا کہ ان سونے والوں میں سے آپ کونسے ہیں۔ دوسرے کی نشاندہی پر تیسرے نے کہا کہ آپ کو لے چلو۔ اس رات اور کوئی واردات پیش نہیں آئی حتّٰی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فرشتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ مزید واقعات جو حدیث میں آگے بیان ہیں وہ کسی دوسری رات میں رونما ہوئے۔ اب فقط تین فرشتوں کی آمد کو اسراء کا نام دینا اور پھر اسے قبل وحی کا واقعہ قرار دینا ایک ایسی گتھی ہے جسے سلجھا لینا آسان نہیں ہے۔ امام ابن حجر اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فرماتے ہیں : لعلّہ اراد ان یقول بعد ان اوحی الیہ فقال قبل ان یوحی الیہ (ممکن ہے کہ راوی یہ کہنا چاہتے ہوں کہ وحی کے بعد ایسا ہوا مگر کہہ یہ گئے ہوں کہ وحی سے پہلے ہوا)۔

بہرکیف ایک طرف یہ روایت ہے اور دوسری طرف بخاری و مسلم کے دیگر ابواب، بالخصوص بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النجم میں بہت سی احادیث ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قربت و رویت کا ذکر سورۂ نجم میں ہے، اس میں فریقین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام ہیں۔ امام بخاری کا والنجم کی تفسیر میں ان احادیث کو لانا اور شریک والی روایت کو نہ لانا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا ذاتی رجحان یہی ہے کہ والنجم میں فریق ثانی جبریل ہیں نہ کہ باری تعالیٰ۔ مثلاً باب فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں وہ حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت لائے ہیں : انہ رای جبریل لہ ستمائۃ جناح۔ یہ روایت مسلم، کتاب الایمان، باب ولقد رآہ نزلۃ اخری وھل رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربہٗ لیلۃ الاسراء میں بھی موجود ہے۔ اسی باب میں ذرا آگے حضرت عائشہؓ کی روایت مسروق سے موجود ہے جس میں وہ فرماتی ہیں : تین باتیں ہیں جن میں سے ایک بھی کوئی کہے تو وہ اللہ پر بڑا افتراء کرے گا۔ راوی نے کہا، وہ کیا ہیں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا

جس نے یہ دعویٰ کیا کہ محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا، اس نے اللہ پر افترا باندھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں ٹیک لگائے تھا، پس میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے کہا: اے ام المومنین! ٹھیریئے، جلدی نہ کیجیے، کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے اس امت میں سب سے پہلے ان آیات کے متعلق آنحضورؐ سے پوچھا تھا، آپ نے فرمایا کہ "وہ تو جبریلؑ ہے۔ میں نے اُسے اس کی پیدائشی صورت میں انہی دونوں مواقع پر دیکھا ہے۔" پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا، کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ فرماتا ہے: لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔۔۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ يُكَلِّمَهُ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا۔۔۔ اس حدیث میں جو کچھ حضرت عائشہؓ نے اپنی طرف سے فرمایا ہے، اس میں اختلاف ہو یا نہ ہو لیکن جو کچھ آپ نے آنحضرتؐ سے نقل فرمایا ہے اس کی حیثیت حدیثِ مرفوع کی ہے۔ اس میں قیل وقال کی گنجائش نہیں ہے اور اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آیات والنجم میں آنحضورؐ کے علاوہ جس دوسری ہستی کا ذکر ہے، اس سے مراد جبریلؑ امین ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ یا عینیؒ کا یہ قول کہیں ان کی شرح میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضورؐ نے معراج میں یا دوسرے کسی موقع پر مادی آنکھوں سے اللہ کو دیکھا ہے، بلکہ اس کے خلاف اقوال موجود ہیں۔ ابن حجرؒ، کتاب التفسیر، باب قولہ اوحیٰ الی عبدہ ۔۔۔ میں اسی قول کو اوضح فی المراد کہتے ہیں کہ آنحضورؐ نے جسے دیکھا وہ جبریلؑ ہیں۔ کتاب التوحید میں بھی انہوں نے امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے اقوال نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فانی دنیا میں اللہ کی رویتِ عینی ممکن نہیں ہے۔ رأیت ربی فی احسن صورۃ ۔۔۔ والی حدیث کی پوری عبارت سے واضح ہے کہ اس میں جس رویت کا ذکر ہے وہ حالتِ منام کی ہے، اس لیے اسے مادی آنکھوں کی رویت سمجھنا صحیح نہیں۔ یہ حدیث احمد اور ترمذی کے حوالے سے مشکوٰۃ، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ میں درج ہے اور وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض دیگر روایات میں رویتِ باری کا ذکر ملتا ہے، لیکن ان میں بھی یہ تصریح نہیں ملی کہ آنحضورؐ نے ذاتِ باری کو بچشم سر دیکھا ہے۔

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ فکان قاب قوسین او ادنیٰ میں اگر فاعل اللہ نہ ہو تو پھر عبدہٖ کی ضمیر اللہ کی طرف کیسے راجع ہو سکتی ہے، اس میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔ قرآن اور لغتِ عرب میں مرجع کے بعید یا غائب یا مؤخر ہونے کی مثالیں موجود ہیں تمام علماء و مفسرین جنہوں نے والنجم کی ان آیات میں جبریل کو فریق ثانی قرار دیا ہے، انہوں نے بھی عبدہٖ میں ضمیر کا مرجع اللہ ہی مراد لیا ہے اور اوحیٰ اور عبد کے الفاظ کو اس کے لیے واضح قرینہ سمجھا ہے۔

ضلالت و ہدایت

سوال: آپ کا لٹریچر ۱۷ سال کی عمر میں ۱۹۴۸ء میں پڑھنا شروع کیا اور ۵۲ء تک تقریباً تمام کتابیں خرید کر پڑھ ڈالیں۔ ۵۱ء کے سالانہ اجتماع کراچی میں بھی شرکت کی پھر متفق جماعت بن گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر حتی الامکان چلنے کی کوشش کرتا رہا۔

۵۳ء یا ۵۴ء میں ماہنامہ ۔ ۔ ۔ پڑھنے کو مل گیا جس سے گمراہ ہو گیا اور کفر کی حد تک جا پہنچا۔ تفہیمات کو کئی بار پڑھا مگر الجھن دور نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہر قسم کا مذہبی لٹریچر پڑھنا چھوڑ دیا۔

دسمبر ۱۹۶۵ء میں "سنت کی آئینی حیثیت" پڑھنے کو مل گئی۔ اس سے بیشتر شکوک دور ہو گئے اور اب اللہ کے فضل سے احکامِ الٰہی کی پابندی کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ

۱۔ جو زندگی میں نے اسلام کے مطابق بسر کی تھی کیا مجھے اس کا کوئی اجر ملے گا یا وہ کفر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مارا جائے گا۔

۲۔ انسان جب گمراہ ہوتا ہے تو بعض اوقات نیک نیتی سے بھی ہوتا ہے۔ ایسے

موقع پر عام آدمی کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ سیدھے راستہ پر ہے یا نہیں۔
راہِ حق پر استوار رہنے کی صحیح تدبیر کیا ہے۔
۳۔ دین کی کچھ باتیں، اگر عقل تسلیم نہ کرے تو کیا کرنا چاہیے۔ ایمان تو ہم لا سکتے ہیں
اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں مگر دل اس سے مطمئن نہ ہو تو کیا کیا جائے۔

جواب۔ یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ انکارِ حدیث و سنت اور الحاد کی جانب مائل ہو جانے کے بعد اللہ نے آپ کو راہ راست کی طرف آجانے کی توفیق بخشی۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کو دینِ حق پر ثابت قدم رکھے اور آئندہ آپ لغزش کا شکار نہ ہونے پائیں۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درجِ ذیل ہیں:

(۱) اگر آپ انکار و الحاد کی روش پر قائم رہتے، تب تو ظاہر ہے کہ آپ کی سابق اسلامی زندگی کے اعمال بالکل اکارت جاتے۔ لیکن اب جبکہ ضلالت کا دور مستقل ثابت نہیں ہوا، بلکہ آپ پھر اسلام کی طرف پلٹ آئے ہیں، اس لیے اللہ آپ کو سابق عمل صالح کا بھی اجر دیگا۔ اس بات کی دلیل خود قرآن سے ملتی ہے۔ سورۂ حدید کے آخر میں جن لوگوں کو رسالتِ محمدی پر ایمان لانے کے نتیجے میں دوہرے اجر کی بشارت دی گئی ہے، بعض مفسرین کے نزدیک ان سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ اہلِ کتاب بعثتِ محمدی سے پہلے تو اسلام پر تھے، مگر آنحضورؐ کی نبوت کے بعد جب وہ فوراً ایمان نہ لائے تو کافر ہو گئے۔ اس کے باوجود اللہ یہ خوشخبری ان کو دیتا ہے کہ اگر تم اب بھی مسلم بن جاؤ تو تمہاری پہلی اسلامی زندگی کا اجر ضائع نہ ہو گا۔ بعض صحیح احادیث سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے اہلِ کتاب کے لیے دُونا اجر ہے۔

(۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان بعض اوقات نیک نیتی سے بھی گمراہ ہو جاتا ہے لیکن ایسی صورت میں اگر تین باتیں انسان میں موجود ہوں تو بالعموم گمراہی کا احساس ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھ، کان اور اپنے دل و دماغ پر تالے ڈال کر نہ رکھے تاکہ جو چیز بھی اس کے سامنے آئے، اس کا کھلے دل اور کھلی آنکھ کے ساتھ مشاہدہ کر سکے، خواہ وہ

اس کی طبیعت اور مذاق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ انسان جو رائے بھی قائم کرے وہ دیانت داری اور بے لوثی کے ساتھ قائم کرے اور ضمیر کی آواز کو کبھی دبانے کی کوشش نہ کرے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان گمراہی کو محض اس وجہ سے پسند کرتا ہے اور اسے راست روی پر ترجیح دینے کے لیے اس لیے بہانے تلاش کرتا ہے کہ گمراہی اس کے مرغوبات نفس کے مطابق ہوتی ہے یا اس سے انسان کے ذاتی اغراض و مقاصد وابستہ ہوتے ہیں۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ انسان ہر وقت اللہ سے دعا مانگتا رہے کہ وہ اسے صراطِ مستقیم دکھائے اور ضلالت سے بچائے۔ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت یہی دعا ہم مانگتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت کا اصل سر رشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے طلبِ توفیق ہر حال میں لازم ہے۔

(۳) بحیثیتِ مجموعی دینِ اسلام کے متعلق یہ اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے اور اس کی تعلیمات فی الجملہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک حکم اور اس کے ایک ایک جز کے متعلق عقلی اطمینان ضروری ہے، نہ ممکن ہے۔

مطبوعات

معارف الحدیث جلد سوم | تالیف مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ۔ شائع کردہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ ۔ قیمت مجلّد: آٹھ روپے ۔ غیر مجلّد: سات روپے ۔ صفحات ۴۹۲

زیر تبصرہ کتاب تفہیم حدیث کے لیے ایک بڑی مبارک اور کامیاب کوشش ہے ۔ کتاب کی یہ جلد بھی پہلے دو حصوں کی طرح نہایت عام فہم اور سادہ ہے اور علمی بحثوں سے دامن بچا کر ایک مسلمان کو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتی ہے ۔

معارف الحدیث کی پہلی جلد میں ایمان اور آخرت سے متعلق اور دوسری میں تزکیۂ قلب و نفس اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق احادیث نبوی کو یکجا کیا گیا تھا ۔ اب اس تیسری جلد میں طہارت اور نماز کے بارے میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال و افعال کو جمع کیا گیا ہے ۔ ان احادیث کو پڑھ کر انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نظامِ عبادات میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے اُس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ بیشمار حضرات نے حضور سرورِ دو عالم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھا اور اُس کی عملی صورت اُن کے سامنے رہی ۔ پھر اللہ کے ان پاکباز بندوں نے اس صورت سے بعد کے آنے والوں کو بڑی دیانتداری کے ساتھ آشنا کیا اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ حضور سرورِ دو عالم کا طریقِ عبادت منتقل ہوتا رہا ۔ چنانچہ آج ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نماز اُسی طریق پر ادا کرتے ہیں جس طریق پر کہ حضور خود ادا فرمایا کرتے تھے ۔

فاضل مصنف مشہور حنفی عالم ہیں لیکن انہوں نے اپنے اس فقہی رجحان کے زیر اثر آکر

کسی مقام پر بھی حق و انصاف کا دامن نہیں چھوڑا اور بعض امور میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اُس کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہ اختلاف حق و باطل کا اختلاف نہیں جس میں مسلمان خواہ مخواہ اپنی صلاحیتیں ضائع کرتے پھریں بلکہ یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے جس کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما ہے کہ حضورؐ کے اُس فعل کی پیروی کی جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں سب سے زیادہ افضل تھا۔ اس ضمن میں فاضل مصنف کی چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

"نماز میں آمین بالجہر کہی جائے یا بالسر! یہ مسئلہ خواہ مخواہ معرکہ کا مسئلہ بن گیا، حالانکہ کوئی با انصاف صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ حدیث کے مستند ذخیرے میں جہر کی روایت بھی موجود ہے اور سِر کی بھی، اسی طرح اس سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ صحابہ اور تابعین دونوں میں آمین بالجہر کہنے والے بھی تھے اور بالسر کہنے والے بھی اور یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طریقے ثابت ہیں اور آپ کے زمانہ میں دونوں طرح عمل ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ائمہ کے درمیان اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔ جواز سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے"۔

پھر رفع یدین کی احادیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" ان سب حدیثوں کو سامنے رکھ کر ہر منصف صاحبِ علم اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نماز میں رفع یدین کا بھی رہا ہے اور ترکِ رفعِ یدین کا بھی ۔ ۔ ۔ ۔ صحابہ کرام کے درمیان ترجیح و اختیار میں اختلاف اس وجہ سے ہوا ہے کہ ان میں سے بعض نے اپنے غور و فکر، اپنے دینی وجدان و ادراک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے مطالعہ و تجربہ کی بنا پر یہ سمجھا کہ نماز میں اصل ترک رفع یدین ہے اور رفع یدین جب ہوا ہے وقتی اور عارضی طور پر

ہوا ہے حضرت ابن مسعودؓ جیسے صحابہ کرام نے یہی سمجھا اور امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ ائمہ نے اسی کو اختیار کیا اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر وغیرہ دوسرے بہت سے صحابہ کرام نے اس کے برعکس سمجھا، اور حضرت امام شافعی اور امام احمد وغیرہ نے اس کو اختیار کیا اور یہ لڑنے کا یہ اختلاف بھی صرف فضیلت میں ہوا، رفع اور ترک رفع کا جواز سب کے نزدیک مسلّم ہے۔

اللہ تعالیٰ غلو اور نا انصافی سے حفاظت فرمائے اور اتباعِ حق کی توفیق دے"۔

اس کتاب میں نماز کی ساری صورتیں اور اُن کے آداب بیان کیے گئے ہیں اور اس باب میں کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ اس میں مختلف دعائیں بھی درج ہیں۔

یہ کتاب ہر لحاظ سے بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس نیک اور مقدس کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق دے۔

کتاب کا معیار طباعت اور کتابت عمدہ ہے۔

تمدنِ یورپ | تالیف: جناب ڈاکٹر احسان محمد خاں، ایم، اے، پی، ایچ۔ ڈی۔ ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو، شیلڈن روڈ، نزد اُردو کالج کراچی۔ قیمت چھ روپے۔ صفحات ۲۸۸

اس کتاب میں یورپی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، مثلاً خاندانی زندگی، نوعمروں کی اقتصادی آزادی اور ان کے باہمی اختلاط کے مضر نتائج، زن و شو کے تعلقات، مغربی تہذیب میں عورت کا مقام، مذہب، عقد و مناکحت، تہذیب کے خلاف بغاوت، شہروں اور گاؤں میں تصادم، کارل مارکس کی تلقین میں صداقت، روس میں اشتراکیت کا تجربہ، جمہوریت سے گریز اور اس کا مستقبل، پیرس کی عورتیں، یورپ کے تمدن اور معاشرہ پر دوسری جنگِ عظیم کے اثرات۔

کتاب کے عنوانات بڑے وسیع ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی سیر حاصل بحث

نہیں کی گئی۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے یہ سب کچھ بغیر کسی ذہنی کاوش کے قلمبند کر دیا ہے۔ پھر بعض مسائل میں اُن کی آراء بالکل سطحی معلوم ہوتی ہیں اور اُن میں ہمیں وہ گہرائی معلوم نہیں ہوتی جس کی کہ اُن جیسے فاضل مصنف سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے مثال کے طور پر انہوں نے ضبطِ ولادت کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مذہب کے متعلق اُن کی تصریحات بھی محلِ نظر ہیں۔

کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بھی کوئی علمی زبان نہیں۔ مثلاً یہ فقرہ دیکھیے:

"روزمرہ کی زندگی پر رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا فرق دکھانے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی کہ پیدائشی اولاد کو روکنے کے لیے رومن کیتھولک فرقہ عقل آرائی سے کام نہیں لیتا۔ وہ سلسلۂ تناسل کو منقطع کرنا مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے مذموم خیال کرتا ہے۔"

اسی قسم کا انداز بیان پوری کتاب میں ملتا ہے۔ اس میں نہ تو زبان کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ خیالات کی ترتیب کو کوئی اہمیت دی گئی ہے۔

معیار طباعت و کتابت بھی اچھا نہیں۔

وطن کے پاسبان | مرتبہ جناب حکیم نشتر صاحب۔ ناشر: مکتبہ عالیہ۔ ایبک روڈ، لاہور

پاکستان و بھارت کی سترہ روزہ جنگ کے دوران اس ملک کی مسلح افواج اور قوم نے ایسی عالی ہمتی، جرأت اور تدبر کا ثبوت دیا جو ہر لحاظ سے روشن مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر زندگی کی حرارت اور ولولہ موجود ہے اور ہم زبردست سے زبردست چیلنج کے مقابلے کی سکت رکھتے ہیں۔ یہ سکت ہمیں کہاں سے میسر آئی ہے اس کے متعلق جناب میجر شجاع الدین بٹ صاحب نے پیش لفظ میں فرمایا ہے کہ یہ لاریب سعادت اور عزم و حوصلہ اُس ایمان و ایقان کا نتیجہ اور برکت ہے جو اس گئے گزرے دور میں بھی اُمت

مسلمہ کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے" خدا کرے کہ ہم قوت و طاقت کے اس لازوال خزانہ سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیر تبصرہ کتاب پاکستان کے شہداء اور نمازیوں کے طرح پر ور کارناموں پر مشتمل ہے اس کے پڑھنے سے اس مقدس جذبہ کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ان کے پیچھے کارفرما تھا۔

کتاب میں ایک نوجوان شہیدہ کی تصویر نامناسب معلوم ہوتی ہے۔

معیار طباعت و کتابت گوارا ہے۔

(بقیہ اشارات)

بے جا نہ ہوگا اگر بات ختم کرنے سے پہلے ہم گانے بجانے کے متعلق حضور سرورِ کائنات اور دیگر صلحائے امت کے چند اقوال نقل کر دیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام کے سچے علمبردار اس "آرٹ" کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول ہے:

الغناء ینبت النفاق فی القلب	گانا دل میں نفاق کی اس انداز سے آبیاری کرتا
کما ینبت الماء الزرع۔	ہے جس طرح کہ کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے۔

یعنی غناء انسان کی قوتِ عمل بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور وہ ایک ایسی ذہنی عیاشی کا شکار ہو جاتا ہے جس سے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر حضور نے فرمایا:

الغناء مفسدۃ للقلب	غناء و سماع دل کو بگاڑنے والی اور خدا کو
مسخطۃ للرب	ناراض کرنے والی چیز ہے۔

موسیقی سے دل کے اندر جو سوز و گداز پیدا ہوتا ہے وہ انسان پر کوئی صحت مند

اثرات مرتب نہیں کرتا بلکہ اُس سے انسان ایک روگ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے اللہ اور اس کے احکام سے غافل کر دیتا ہے اور اس بنا پر موسیقی کا شیدائی باری تعالیٰ کا مقرب بندہ بننے کے بجائے اُس کی ناراضگی کا ہدف بنتا ہے۔

ہمارے ائمہ سلف گانے بجانے کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ خلیفۃ الرسول حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ نے اپنے بچوں کے اتالیق کو تحریر فرمایا۔

"تمہیں سب سے پہلے میری اولاد کے دل میں باجوں، گاجوں اور راگ راگنیوں کے متعلق جذبہ نفرت پیدا کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ایسے مذموم کام ہیں جن کے لئے سب سے پہلے شیطان تحریک کرتا ہے اور جو باری تعالیٰ کے غیظ و غضب کو انگیخت کرنے والے ہیں۔ مجھے اپنے دور کے نہایت ثقہ علماء سے یہ بات پہنچی ہے کہ ان کاموں سے دل میں نفاق اسطرح پرورش پاتا ہے جس طرح بارش میں گھاس

مسند امام احمد میں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث درج ہے جس میں حضور نے بعثت کے جملہ مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی بیان فرمایا۔

ان اللہ بعثنی رحمۃً وھدًی للعالمین وامرنی ان امحق المزامیر والکبادات یعنی البرابط والمعازف والاوثان التی کانت تعبد فی الجاھلیۃ۔	اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہانوں کے لئے سراپا رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم صادر فرمایا ہے کہ میں باجوں گاجوں کو، مرابط اور دوسرے سامان لہو و لعب اور جاہلیت کے بتوں کو دنیا سے محو کر دوں۔

مشہور صوفی حضرت فضیل بن عیاض نے غناء کے مفاسد کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر کہا ہے کہ الغناء رقیۃ الزنا۔ یعنی غناء زنا کے لیے افسوں کی حیثیت رکھتا ہے یعنی گانے بجانے سے انسان کے اندر زنا کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسی محفل سماع جو ایک

فاسقانہ ماحول میں منعقد ہو رہی ہو، جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شریک ہو کر ساز کی دھنوں کے ساتھ عشقیہ اور مخرب اخلاق گیت گا کر ذہنی عیاشی کے طلبگار سامعین کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنا اپنے فن کا کمال سمجھتی ہوں۔ اس بدیہی حقیقت کو مغرب کے بڑے نامور ماہرین نفسیات تک نے تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں "نفسیاتِ جنس" کے مصنف کی تصریحات قابلِ غور ہیں۔

"نغمہ اور آواز صنفی جذبات کو متلاطم کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ میں اس معاملے میں مسٹر مول کے ساتھ پوری طرح متفق ہوں کہ کانوں کے ذریعہ انسان کے صنفی جذبات جس قدر منتقل ہوتے ہیں ان کی قوت کا ابھی تک انسان صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ انسانی طبائع پر بڑی شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے اور یہی چیز بسا اوقات سامع اور مغنی یا مغنیہ کے درمیان اچانک عشق کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔ آواز کی حیرت انگیز اثر آفرینی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ لاتعداد عورتیں گویوں کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔"

مقصدِ زندگی کو سمجھنے کیلئے چند بلند پایہ کتب

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

— از: سید ابوالاعلیٰ مودودی —

(غیر اسلامی ماحول میں دعوتِ اسلامی کا طریقہ کار)

- جمہوری ملک میں اسلامی انقلاب کی سبیل
- دینی اور لادینی قوتوں کی کشمکش کے درمیان صحیح لائحہ عمل
- برصغیر پاک و ہند میں پچھلی ربع صدی کی کشمکش کا تجزیہ
- آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔ قیمت ۳ روپے

تعلیمات

— از: سید ابوالاعلیٰ مودودی —

(نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

- موجودہ نظامِ تعلیم کے بنیادی نقائص؟
- مسلمانوں کے لیے صحیح نظامِ تعلیم کی بنیادیں؟
- ایک اسلامی یونیورسٹی کے لیے نصابی خاکہ
- تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کا مفصل جواب قیمت ۳٫۲۵ روپے

مسئلہ جبر و قدر

— از: سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت اور اس کے بارے میں صحیح اسلامی مسلک۔
- عقیدۂ تقدیر کی افادیت اور اس کے زندگی پر اثرات
- فکر و نظر کی الجھنوں کا اطمینان بخش حل۔
- آفسٹ کی عمدہ طباعت۔ قیمت ۱٫۸۰ روپیہ

سفرنامہ ارض القرآن

— از: محمد عاصم —

- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پاکیزہ سفر کی روداد
- قرآن مجید میں مذکور مقامات کی تلاش و تحقیق۔
- اُممِ سابقہ کی مستند اور مفصل سرگزشت۔
- عرب ممالک کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات کا جائزہ
- خوبصورت گردپوش۔ قیمت ۴/۷۵ روپے

اسلام اور اجتماعیت

— از: مولانا صدرالدین اصلاحی —

- دین میں اجتماعیت کا کیا مقام ہے؟
- اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے زندگی پر اثرات
- اسلامی اجتماعیت کی ہیئتِ کاملہ
- منظم اسلامی زندگی گذارنے کیلئے ایک ناگزیر کتاب

قیمت صرف۔ ۲/۷۵ روپے

فریضۂ اقامتِ دین

— از: مولانا صدرالدین اصلاحی —

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)

- امتِ مسلمہ کا نصب العین اور مقصدِ وجود کیا ہے؟
- فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور ادائیگی کے طریقے۔
- ملت کے خوابیدہ ذہن کو جھنجھوڑنے والی کتاب۔

قیمت ۲٫۵۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰